جسارت، کراچی

ایک خط

مکرمی!

جناب افضل آرش نے غالباً روا روی میں لکھ دیا کہ:

"جناب خالد کا یہ دعویٰ ہے"! کیونکہ دانستہ وہ ایسی صریح غلط بیانی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ یہ میرا حُسنِ ظن ہے کیونکہ حکم ہے کہ ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا

ع اہلِ ایماں سے حُسنِ ظن رکھو!

ارشاد ہے جنابِ رسالتمآبؐ کا ——— اِیَّاکُمْ وَالظَّنّ

ع بدگمانی سے احتراز کرو!

کیونکہ ——— حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ

ع حسن عبادت ہے حُسنِ ظن بھی

اگرچہ اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور لوگوں کے فساد و شر سے بچنے کے لیے اسے ایک ڈھال بھی بنانا چاہیئے۔ وفی حدیث عمر: اِحْتَرِسُوْا مِنَ النَّاسِ بِسُوْءِ الظَّنِّ)

خالد اور دعویٰ؟ خالد کو جو اتراہٹ کو اوچھا پن اور دعوے کو جہالت بلکہ جہل مرکّب سمجھتا ہے۔

فخر شیوہ نہیں شریفوں کا
غرّہ علم کیا مرے بھائی!

ع رَبُّ الافلاک کہاں اور کفِ خاک کہاں!

تخلیق تو عجز و انکسار کا شعبہ ہے۔ فن تو ناتمامی نارسائی

"مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی"

کی داستان ہے۔ بقول عارفِ رومؒ

ہر کہ اُو بیدار تر پُر درد تر

ہر کہ او آگاہ تر رُخ زرد تر

میں نے تو ان بزرگوار سے یہ کہا تھا "توفیق ایزدی اور تائید خداوندی سے اپنی استعداد اور ہمت کی حد تک میری کوشش یہ ہو گی کہ ترجمہ برجستہ بھی ہو اور شعری محاسن کا حامل بھی ـــــــ یعنی اپنے طور پر ایک مکمل ادب پارہ اور قرآن کا وفادار ترجمان ـــــــ "ماشاء اللہ ـــــ وماتوفیقی الا باللہ۔

بقول صاحب جوامع الکلم ﷺ والاتمام من اللہ: ہے یہ ارشادِ جنابِ کبریا لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔

بحمدللہ۔ آخری پارہ مکمل ہو چکا ہے۔

"تفاسیر" کے بارے میں سروان سے گفتگو ہی نہیں ہوئی کیونکہ میں تو تفسیروں کے یکسر خلاف ہوں اور کسی انسان کو خود کو خدا کا نفس ناطقہ سمجھنے اور یہ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا:

"ان تمام شکوک و شبہات کو رفع کردوں اور ان سوالات کے جوابات دے دُوں جو قرآن کو بااُس کے محض ترجموں کو پڑھ کر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان چیزوں کی وضاحت کردُوں جنھیں قرآن مجید میں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔"

تراجم کے بارے میں البتہ چند مشہور و متداول ترجموں کی مثالیں دے کر میں نے ان سے کہا تھا کہ میں موجودہ تمام نثری اور شعری تراجم سے نامطمئن ہوں۔"

یہ مجھ حقیر پُرتقصیر کی بالکل ذاتی رائے ہے۔

جس سے اختلاف کے ہر حق کو میں کشادہ دلی سے تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ، شاعر!

مانگتے ہیں آزادی

بانٹتے ہیں آزادی

براہ کرم یہ سطور شائع فرما کر ممنون ہونے کا موقع دیں!

بندۂ ناچیز

عبدالعزیز خالد

پری گوشہ عفّت موہانی

اگر تم باوفا ہوتے

عفت موہانی

بڑی دُور سے آتی ہوئی روشنیاں میرے کمرے کی دیواروں پر رقصاں ہیں۔ آس پاس سناٹے کی حکومت ہے۔ نہ کہیں کوئی آہٹ ہے نہ آواز۔ چاند کا زرد مرمریں پیکر جو بحرِ نیلگوں میں سفر کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ پچھم کی طرف ڈوب گیا ہے، روز اس وقت تک مجھے نیند آجاتی تھی لیکن آج تو وہ بھی دشمن بن گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے۔

لکھنے والے نے عمر بھر کے لئے مری قسمت میں رت جگے لکھے

سناٹا ماضی کی کہانی کہہ رہا ہے۔ پرانی یادیں پھر دل پر تیر چلانے لگی ہیں۔ میری زندگی کا حسن اب یہی یادیں ہیں۔ یہی میرا سرمایہ۔

نرسنگ ہوم کی ہولناک فضا، معنی خیز خاموشیوں کا راج، بے آواز اِدھر اُدھر چلتے ہوئے قدم۔ مجھے اس ماحول سے مانوس ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اک ازلی التہاب ہے اک ابدی اضطراب کہ نہ دن کو چین میسّر ہے نہ رات کو راحت۔ بس یادیں۔ یادیں۔ اور میرا بے چین دماغ، میرا مضطرب دل۔ اور پھر ویسے بھی میری دسترس میں جزفغانِ نارسا اور ہے بھی کیا۔

جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ کالج میں ادبی جلسہ تھا۔ اشعار کا مقابلہ۔ شاید کوئی انعام بھی رکھا گیا تھا۔ اشعار کا سُننا انہیں اپنی بیاض میں لکھنا اور ہر دم گنگناتے رہنا میرا شب و روز کا مشغلہ تھا! اس سہ پہر میں نے صالحہ سے سُنا تھا کہ پرنس کالج سے کوئی نیا شاعر ہمارے کالج میں آرہا ہے لیکن میں نے دل میں کہا۔ وہ بھلا مجھ سے کہاں بازی لے جائے گا! یہ انعام بھی میری ہی تقدیر کا ہے! ویسے میں اس شاعر کو دیکھنے اور سننے کی مشتاق تو بہر حال تھی۔

اور جب اس نئے شاعر پر میری نظریں پڑیں تب دل میں جیسے چراغاں سا ہو گیا۔ کتنی دیدہ زیب اور مسحور کُن شخصیت تھی! حسن اس چہرے پر برس رہا تھا۔ پھر اس نے شعر سنانے شروع کئے! ایک سے ایک حسین، خوبصورت اور دل میں اتر کر بے چین کر دینے والے شعر۔ تعریف و ستائش میں اسے نہلا دیا گیا۔ یہ اعزاز کسی کو بھی مغرور کر دینے کے لئے کافی تھا مگر وہ بدستور سیدھے سادھے انداز میں اپنے شعر سناتا اور مسکراتا رہا۔ مجھے یہ شعر

سب سے زیادہ پسند آیا تھا ؎

محبّت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے　　اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

یہ شعر اِس کے لبوں سے نکلا۔ میرے دل میں اُتر گیا اور میری ساری زندگی اسی شعر کی تشریح بن کر رہ گئی۔

صالحہ نے تعارف کرایا تھا "آپ سے ملو۔ پرنس کالج کے ہونہار طالب علم اور مایہ ناز شاعر مسٹر خالد!" پھر اس نے شاید میرے بارے میں بھی کچھ کہا تھا۔ لیکن میں تو اس کی خوب صورتی اور دلآویز مسکراہٹ سے اتنی متاثر ہو گئی کہ شاید ایک رسمی سا جملہ بھی کہہ نہ سکی! اور پھر میری زندگی ہی بدل کر رہ گئی!

خالد صاحب آپ نے بھی میرے تعارف پر غیر معمولی مسرّت کا اظہار نہ کیا! بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی تھی! اس نگاہ میں آپ کے لئے کچھ نہ تھا مگر میرے لئے بہت کچھ تھا۔ مجھے تو بس یہی احساس تھا کہ ازل سے میں اسی ایک شیریں، مسحور کُن اور حسین نگاہ کی منتظر تھی!

لیکن اب میرا دل بے آواز کہہ رہا تھا ؎

تمنّا تری ہم نشینی کی ہے　　بس اک ساعتِ مختصر کے لئے

قسمت ہی کی تو بات ہے۔ آپ سے مجھے سب کچھ مل گیا، محبّت، الفت، توجّہ التفات مجھے اپنی تقدیر کی نارسائی کا کوئی گلہ ہی نہ رہ گیا! آپ اور میں برسہا برس کے جانے پہچانے ہو گئے۔ اپنی زندگی اور اس سے وابستہ ساری رعنائیاں میں نے آپ پر نچھاور کر دیں۔ لیکن خاموشی سے کہ وہ دیوتا جس کے قدموں میں کوئی نذرانہ رکھا گیا اور اُسے خبر بھی نہ لگی کہ اسے کون سی چیز نذر کی گئی۔

بعض لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں جنہیں پہلی ہی دفعہ دیکھ کر ہم نے سوچنے لگتے ہیں کہ وہ بس ہمارے ہیں! جب آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا تب ہی سے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ آپ صرف اور صرف میرے ہیں!

بعد کو آپ نے بھی کہا تھا کہ "عشرت بس ایک تم ہو جس سے باتیں کر کے خوشی ہوتی ہے۔ تم میری ہم دماغ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرے شعر ان کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔ جنہیں تم اتنے ذوق سے سنتی ہو اور یاد بھی رکھتی ہو۔ تم سا کوئی دوسرا میرا شیدا نہیں ہے۔"

تب میں نے بھی اعتراف کیا تھا کہ پہلے میں دوسرے شاعروں کی مرخرفات سے اپنی بیاضیں بھرا کرتی تھی مگر اب آپ سے ملنے اور آپ کے اشعار سُننے کے بعد اُن چراغوں میں روشنی نہیں رہی۔

میں محبّت کی تمنّائی، خلوص کی پیاسی تھی۔ جو آپ نے بن مانگے مجھے عطا کر دیا تھا۔ میں خود کو دُنیا کی خوش نصیب ہستی سمجھتی تھی! اور میرا ایمان تھا کہ۔ محبّت کی وہ ساری کہانیاں جو ابھی تک دنیا میں مشہور

ہیں۔ وہ سب یوں ہی سطحی بے تہہ سی ہیں! میری محبّت کے آگے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ محبّت میں کسی کے لئے جان دینا، کسی کا نام بار بار لینا، اسی ایک ہستی کے خیال میں ڈوبے رہنا کتنا کیف آور، جاں نواز اور زندگی بخش کام ہے! لیکن یہ سب میں آپ سے کہہ نہ سکی! محبّت کو زبان ملتی ہے تو وہ اپنی ساری شدت کھو دیتی ہے۔ بے زبانی محبّت کی سب سے خوبصورت علامت ہے!

سچ مانیئے کہ میری زندگی میں قدم رکھنے والے آپ پہلے انسان تھے جنہوں نے محبّت کے نام پہ مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ خلوص کی آڑ میں میرے محسوسات کا مذاق نہیں اُڑایا۔ ہمدردی اور اپنائیت کے بہانے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے۔ وہ میں نے خود ہی اپنے آپ کو ایک مسلسل دھوکے میں رکھا۔ یہ تو مجھے بہت بعد کو معلوم ہُوا کہ آپ مجھ سے خالص زبانی محبّت کرتے رہے آپ کے پاکیزہ جذبے میں کوئی ملاوٹ نہ تھی! آپ سراب نہ تھے۔ آپ آب حیات کا چشمہ تھے مگر میرے لئے نہیں! ساری خطائیں میری ہی تھیں! اکثر مجھے وہم ہوتا۔ یہ دن یہ راتیں کہیں خواب تو نہیں۔ یا مسلسل خواب کا کوئی دل خوش کُن حصہ ابھی آنکھ کھل جائے گی۔ کاش وہ خواب ہی ہوتا۔ میں آپ کو پاکر ساری دنیا کو بھول گئی۔ ایک دنیا میری تھی۔ میرا گرد و پیش ایک ابدی ترنّم سے گونجا کرتا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ؎

دستبردِ مرگ کا کیا ڈر مجھے میں ازل سے ہوں ابد تک کیلئے

کتنی ہی دوسری لڑکیاں، آپ کی پرستش کرتی تھیں۔ لوگ آپ کی ہم نشینی کو اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے لیکن آپ اتنے بے پروا تھے۔ کسی کی طرف آپ نے رخ ہی نہ کیا۔ لیکن آپ نے مجھ بے بضاعت کم سواد اور بے نام سی ہستی میں جانے کیا دیکھ لیا تھا۔ آپ نے اپنی توجّہ اور التفات کی بارش مجھ پر برسا دی۔ آپ کی کتنی کتابیں میرے پاس سرمایۂ حیات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ وہ بے شمار حسین اور شاعرانہ خط جو میرے لئے بطور حرزِ جاں ہیں۔ ان سب پہ میں نازاں و مفتخر ہوں! میرا دل چاہتا تھا کہ آپ کی بے پایاں محبّت کے احساس پہ میں ایک مرتبہ خوب جی بھر کے رولوں محبّت رلاتی ضرور ہے۔ آنسو چاہے کامیاب محبّت کے ہوں۔ کہ ناکام محبّت کے۔ آنکھوں میں آتے ضرور ہیں۔ مگر اپنی کامیاب ترین محبّت پہ ایک بھولا بھٹکا آنسو بھی میری پلکوں کو بھگو نہ سکا۔ میرے لب سدا تبسّم آشنا ہی رہے۔ آنسو بزدلی کی نشانی ہیں۔ میں تو فاتح تھی۔ ایک بے حد خوب صورت دل فتح کیا تھا میں نے ویسے مجھے بخوبی احساس تھا کہ آپ کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ کہاں تھے اور میں کہاں۔ آپ عرش میں فرش۔ میں جتنی بھی مدح سرائی کرتی تھی۔ اس کے بارے میں بھی مجھے خوب علم تھا کہ وہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ نے تھوڑی ہی سی مدّت میں فلک آسا شہرت و عظمت حاصل کر لی تھی۔ میرا تو یہی اعتقاد تھا کہ آپ کا سا شاعر نہ پہلے کبھی دنیائے ادب و شعر میں گزرا تھا اور نہ آئندہ کبھی گزرے گا۔

میں اپنی محبّت کے ایورسٹ پر تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ ہوسٹل کو خیرباد کہہ کے وطن واپس جا رہے ہیں۔ یہ خبر میرے خرمن دل پہ بجلی بن کر گری! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب میں زندہ نہ رہ سکوں گی! استفسار پر آپ نے کہا تھا۔

"وطن میں میرا پورا کنبہ ہے ماں باپ بھائی بہنیں اور بیوی بچّے۔ میری واپسی ناگزیر ہے؟ میں جب یہاں آیا تھا تو ڈر رہا تھا۔ کہ نجانے کیسا ماحول ملے گا! کیسے دوست احباب ہوں گے۔ لیکن یہاں تم مل گئیں اور میرے شب و روز خوب صورت اور ماحول دلچسپ ہو گیا! عشرت! پردیس چھوڑتے میرا دل دکھتا ہے۔ وہاں تم بہت یاد آؤ گی!"

اور بس۔ میری لازوال محبّت کا حسین ترین تاج محل یکبارگی زمیں بوس ہو گیا! لیکن تب بھی میرے لبوں پر کوئی آہ نہ تھی۔ میری پلکوں پہ کوئی آنسو نہ تھا! میری محبّت اتنی سستی، اتنی نیچی ایسی کم ظرف نہیں تھی کہ آپ کو کسی اور کا نصیب جان کر روتی سسکتی شکوہ کناں ہوتی۔ میں تو اب بھی بیحد خوش تھی۔ آپ کو جو میں نے سرتاپا اپنا سمجھا تھا۔ یہ احساس کیا کم جانفزا تھا! پھر جانے کیا ہوا تھا کہ دل میں ایک پھانسی سی بے شک کھٹکنے لگی تھی۔ میں نے بہت چاہا بہت چاہا کہ کسی طرح آپ کو بھلانے کا سامان کروں۔ اور سوچتی ہوں کہ میرے بس میں تھا فقط تم سے محبّت کرنا۔ وہ میں زندگی کی آخری سانسوں تک کرتی رہوں گی۔ لیکن کسی بات کا عہد کرنا اور اسے عملی شکل دینے میں بہت فرق ہے! یہ میں ہی جانتی تھی کہ پھر میری زندگی کتنی کربناک ہو کر رہ گئی۔ آپ کی یاد کی خلش۔ آپ سے مل بیٹھنے کی چاہت۔ آپ سے جدائی۔ کتنے آتش فشاں میرے سینے میں جل رہے تھے۔ پھٹ پڑنے کے لئے بیتاب۔ لیکن میرے ہونٹوں پر مسکراہٹوں ہی کے لالے کھلے رہے۔

اس روز موسم بڑا قاتل ہو رہا تھا۔ آسمان اودے اودے بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ تیز و تند ہوائیں۔ فرّاٹے بھر رہی تھیں۔ غیر محسوس سی پھوار پڑ رہی تھی۔ تب آپ ملنے آئے تھے۔ کچھ مغموم اور دلگیر سے۔ خاموش اور اداس سے جیسے یہ جدائی آپ پر بھی اپنا اثر چھوڑنے لگی تھی! یا شاید آپ یہ سوچ رہے تھے کہ میں نے اپنے سارے جذبوں اور محسوسات کا مرکز آپ کو بنا کر ایک دکھ مول لیا تھا! یا پھر کوئی اور بات ہو گی۔ کاش۔ میں نے پوچھ لیا ہوتا۔ آپ کیوں اداس تھے۔ آپ کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن آپ بھی دیر تک خاموش رہے اور میں بھی۔ تب بھی میں نے نہیں کہا۔ خالد صاحب! آپ کے لئے میں نے اپنا قرار کھو دیا۔ اپنی زندگی آپ پر نثار کر دی۔ آپ کے جانے کے بعد میرے پاس میرا اپنا کچھ بھی نہ رہے گا۔ نہ جائیے۔ خدا کے واسطے نہ جائیے۔ مگر میں یہ بھی نہ کہہ سکی۔ آج میں بڑی شدّت سے سوچتی ہوں۔ میں رو پڑتی، آپ کا ہاتھ تھام لیتی، آپ سے التجا کرتی۔ مت جائیے۔ تو کیا۔ آپ نہ جاتے؟ شاید۔ کون جانے آپ شاید میری بے تابی دل کے اظہار کا انتظار کرتے رہے۔

میں شاید اپنی محبّت اپنی وفا کی تاثیر دیکھنے کی منتظر رہی۔ اور پھر۔ وقت گزر گیا!

محبّت کے لئے اظہار ضروری نہیں۔ محبّت تو آنکھیں کرتی ہیں۔ دل کرتا ہے۔ اور رونگٹا رونگٹا کرتا ہے۔ میں نے بے شک اپنے سلوک سے اظہار بھی کیا۔ لیکن آپ تو ایک گہرا ساگر تھے۔ موّاج، متلاطم، بے چین مگر خاموش آپ کی تہہ میں کسی صدف میں بند میری محبت کا موتی تو بے شک تھا۔ مگر جسے میں پا نہ سکی۔ وہ اب بھی سینۂ بحر میں محفوظ ہے! صرف میرے لئے! کیا یہ احساس مجھے خوشیوں بھری چند سانسیں عطا کرنے کو کافی نہیں؟

اور پھر آپ چلے گئے! ساری رات مجھے شدید کرب رہا تھا۔ میرا بدن بخار سے پھُنک رہا تھا۔ پچھتاوے میری رگ سے لہو نچوڑ رہے تھے۔ وہ ہاتھ جسے میں نے کبھی چھوا بھی نہ تھا۔ کیوں نہ تھام لیا۔ وہ دامن جس تک کبھی میرا ہاتھ نہ پہنچا تھا۔ میں نے کیوں نہ پکڑا۔ میں تکیے پر سر رگڑتی رہی۔ کھُلی کھُلی جلتی جلتی آنکھوں سے تاریک خلاؤں میں گھورتی رہی۔ شاید دکھائی دے جائے۔ ایک روشن پیکر۔ ایک باوقار مردانہ پیکر۔ جسے دیکھنے کو نظریں پیاسی تھیں۔ احسان کیا بخار کی غفلت نے کہ آپ کے سائے کو میرے پاس پہنچا دیا۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ آپ میرے قریب تھے۔ میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ میرے آنسو پونچھتے تھے۔ آپ کی نرم انگلیوں کا لمس میں نے اپنے بکھرے الجھے بالوں میں محسوس کیا۔ آپ میرے سرہانے بیٹھے تو مجھے آپ کی خوشبو نے سکون پہنچایا۔ آپ کی آواز میرے دل کی گہرائیوں میں انجانا سا ساز بجاتی رہی۔ پھر۔ میری آنکھیں کھلتیں اور آپ کا سایہ دن کی روشنی میں تحلیل ہو جاتا!

اور پھر احساس کی شدّت نے، یادوں کی جگر کاوی نے۔ اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ زبان اگر خاموش بھی رہے تو کیا ہے

صدا دیتا ہے لے آوازِ غم بھی ۔۔۔ کہ خاموشی بھی آہنگ و نوا ہے

میں نے جان بوجھ کر دل کو نہیں بہلایا۔ یہ غم مجھے بڑا تسکین بخش، بجد شیریں اور بہت حسین معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن میرے معالج نے مجھے مژدہ سنایا کہ مجھے بخار مستقل رہنے لگا تھا اور مجھے کسی اچھے نرسنگ ہوم میں داخل ہو جانا چاہیئے۔

کتنی سہانی گھڑی تھی وہ۔ میری دیرینہ تمنّا بر آئی تھی۔ آپ کی محبّت میں دھیمے دھیمے پگھلنا اور ایک دن آپ کا نام لیتے لیتے مرجانا۔ اس جہان خراب سے گزر جانا کتنا لذّت خیز تصوّر ہے۔ محبّت نے کتنی جلدی مجھے سیراب کیا تھا!

بے نام و نشاں جہاں میں جو شے ۔۔۔ مرجھائے، گُلِ دل بشر ہے!

اور میرا دل آہستہ آہستہ مرجھاتا چلا گیا۔ بالآخر نرسنگ ہوم کا سرد و سفید بستر مجھے نصیب ہوا

لیکن یہاں کیا ہے۔ ایک گلوگیر خموشی، اک عذاب جاوید۔ ساکت و صامت اپنے تکیہ پر سر رکھے میں دیکھا کرتی ہوں۔

رات کرتی ہے تعاقب صبح کا　　روشنی کی دو گھڑی رونق کے بعد

میرے خالد صاحب! کیسے بتاؤں۔

کیسے پڑتی ہے جگر میں ٹھنڈک؟　　کیسے بجھتی ہے اگن برہا کی؟

آپ نے تو کر کے گھائل پھر لی نہ خبر۔ کبھی پوچھا نہ دکھاوے کو حال۔ اور میں کیا اپنا حال سنا بھی سکتی ہوں؟ اور میرے بحرِ غم کا کوئی کنارہ نہیں! کیا پوچھیے گا۔ کیا کہہ سکوں گی؟ بس ایک آرزو تھی۔ پہلی اور آخری آرزو کہ۔ کاش۔ میں آپ کے سینے سے لپٹ کر خوب رو لیتی اور وہ سب کچھ کہہ دیتی جو میرے دل میں تھا۔

لیکن اب کیا۔ اس شہر میں اپنوں سے دور، سب سے دور تنہا زندگی کی بچی کھچی سانسیں پوری کر رہی ہوں۔ یہاں کیا ہے؟ قبر کی سی تاریکی، سیلن، گھٹن، اس زنداں میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام، ہائے کون جانے، باہر کی دنیا میں چمکیلا سورج اب بھی اپنی شوخ کرنیں بکھیرتا ہوگا، چاندنی کی مٹھاس میں کلیاں کھل کر پھول بنتی ہونگی۔ آہ۔ میں نے کیا کیا۔ کیسی ہولناک سزا میں نے بھگتی ہے۔ کیا میں اسی طرح چپکے چپکے آپ کا نام لیتے لیتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں گی۔ آپ کو خبر بھی نہ لگے گی۔ سچ مانیئے۔ میری ساری خوش رنگ آرزوؤں کے مرکز۔

میں شبدوں کی پیاسی میں چرنوں کی داسی　　تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

یہ دق گاہ ہے۔ موت کی سرزمین، جہاں میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔ کاش! میں آپ سے کہہ سکتی۔ کاش کوئی کہہ سکے!

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا!

بشکریہ:۔ روبی نئی دہلی دسمبر ۱۹۸۷ء، ۲۵

عفت موہانی

ڈائری کے چند ورق

لسان الکائنات، وحید العصر، پیغمبرِ شاعری، پروردگارِ شعر و ادب، الفاظ کا جادوگر، زبانوں کا سمندر، معنویت کا رازدان، شاعری کا شہنشاہ، اقلیمِ قلم کا تاجدار، معلومات کا ہمالیہ، نورِ طور، ادب و شعر کی جان، افلاکِ تخیل کا طائرِ بلند پرواز، بحرِ علم کا غواص، صفاتِ اعلیٰ کا عرش، غالب کی تمنا، اقبال کی دعا۔ دگر دانائے راز تلمیذ الرحمٰن۔

کیونکر نہ معطر ہو، مشامِ دلِ عفت — چٹکی کی کلی ہے سخنِ حضرتِ خالد
نام تاباں رہے ترا جب تک — آسماں کے چراغ ہیں روشن

o

مدینہ زمین کا عرش ہے — خالد شاعری کا عرش ہے
تُو تو عنوان ہے مری زیست کے افسانے کا

o

تم مرے شاعر ہو بس مرے لیے لکھو

o

ایک معمارِ علم و فن جس نے — کیے تعمیر فکر کے اہرام

o

عبدالعزیز = پیارا بندہ
خالد = ہمیشہ رہنے والا

شاعر کی ہستی میں چند در چند عظمتیں پنہاں ہوتی ہیں۔

ہر قوم اور ہر زمانے میں مصلح پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسی ایسی بے مثال شخصیتیں وجود میں آتی ہیں۔ کہ انبیاء کرام کے سے معجزے کر گزرتے ہیں۔

غالب اور اقبال کے بعد فاطرِ ہستی نے ایک شاعرِ آخر الزمان پیدا کیا۔ جو چار دانگِ عالم میں عبدالعزیز خالد کے نام سے مشہور ہوا۔

عبدالعزیز خالد

ع ——— عبدیت ۔ عبادت ۔ عجز ۔ عزت
ب ——— بسالت ۔ بردباری
د ——— دیانت ۔ دوستی ، دریادلی
ا ——— استقامت ، اولوالعزمی
ل ——— لطافت ، لاانتہا
ع ——— عارف ، عزیز ، علم وعقل
ز ——— زرافشاں ، زرخیز ، زیرک ، زاری
ی ——— یدُاللہ ۔ یقین ۔ یادالٰہی
ز ——— زبان داں ۔ زوال سے پاک
خ ——— خبیر وبصیر ۔ خیروبرکت ۔ خوب صورت ۔ خوب سیرت
ا ——— انسانِ عظیم ، امین ۔ آدرش چاہنے والوں کا
ل ——— لسان العصر ۔ لالہ رُخ ۔ لعل شب چراغِ شعر
د ——— دُرِ بے بہا ۔ دُرفشاں ۔ دُربار

○

نثار اس عفتِ فانی کی عمرِ رائیگاں تجھ پر

کہاوت ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ایک آدمی ہے جسے صرف آدمی کہنا اس کی بڑی توہین ہے۔

بے عیب ذات

خدا کی ہے مگر خدا کی اس صنعت کامل کو کیا کہتے ہیں۔ جس میں کوئی عیب نہیں۔ وہ طیش و برہمی سے دُور ہے۔ وہ غرور و تکبر نہیں جانتا۔ اسے اپنے علم و شخصیت پر فخر و تبختر نہیں ہے۔ اس کے علم و فضل کی جڑیں اس کے ذہن کی زرخیز زمین میں کہاں تک پھیلی ہیں۔ اس کا ادراک و اندازہ کسی کو بھی نہیں۔ وہ ایک گھنا اور گنجان درخت ہے ثمر بار و سایہ دار۔ ساحل پر سے کس سمندر کی لہروں کا شمار نسبتہً آسان ہے۔ لیکن اس بحر العلوم کے آگے پیچھے پکتی موجوں کا شمار آسان کام نہیں۔ جبکہ دیگر گیارہ بارہ زبانوں کے پُر شور دریا بھی جانے کہاں کہاں سے آکر اس بحرِ مواج میں گرتے ہیں۔ اور اس نوبت پر مذکورہ کہاوت غلط ہو جاتی ہے۔ اس وحید العصر شاعر، انسانِ عظیم نے جو صورت میں بے مثال، سیرت میں لازوال اور علم میں باکمال ہے۔ اپنی ایک لاکھ من عقل پر دس لاکھ من علم کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ اور اس بوجھ کے باوجود اتنا سربلند ہے۔ کہ اس بلندی تک اپنی نظریں پہنچانے کے لیے اپنی کمزور آنکھوں پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے حسین و جمیل چہرے کے اطرافِ علم کی روشنی نے اتنی خیرگی پیدا کر رکھی ہے کہ دیکھنے والے کی نظریں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔

بحرِ جہالت میں ایستادہ اس

منارۂ نور

کا نام ہے ——— عبد العزیز خالد

○

صورت، سیرت، قسمت، شہرت، عزت، علمیت، فضیلت، محبت

——— تجھے دینے والے نے کیا کیا دیا ہے۔

○

. . . . . اس کمزور درخت پر مکمل خزاں چھائی ہوئی تھی۔ پتیاں زرد و پژمردہ۔ کونپلوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ شاید وہ کمزور درخت بادِ صرصر کی تاب نہ لاتا۔ زمین پر آ رہتا۔

. . . . . اس سے بڑی دُور ——— بڑی دور ایک زبردست شاہ بلوط سربلند کھڑا تھا۔ اس نے اپنی جڑیں پھیلائیں۔ اور بڑھ کر کمزور درخت کی جڑوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

کمزور کو طاقت ور کا اور کمتر کو برتر کا سہارا ملا۔

کمزور درخت تناور بن گیا۔

اس کی مضمحل پنکھڑیاں تازہ و شاداب ہو گئیں۔ کونپلیں جاندار ہو گئیں۔ شگوفے مسکرائے۔ درخت سرسبز ہو گیا . . . . .

اس پہ بہار آ گئی۔

○

خالد بلند ہے آسمانوں کی طرح
خالد عمیق ہے سمندروں کی طرح
خالد وسیع ہے کائنات کی طرح
خالد فرشتہ ہے انسان کے روپ میں

اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے۔ کہ تم اپنی عمر خالد کو دے دو۔ تاکہ وہ نبی کی محبت کے بہت سے اور گیت گائے۔ تو میں بخوشی اپنی زندگی اسے ارپن کر دوں۔ اور اس سے کوئی اجر نہ مانگوں

○

ایک خواب پسند اور خیال پرست رُوح کس طرح اپنے محبوب اور آئیڈیل شاعر کے گھر میں یہاں وہاں پھرتی رہتی ہے۔ یہ یہاں وہاں پھرتی رہتی ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ عجیب قربتیں ہیں۔ عجب دوریاں!

○

خوب صورت چاند کی دیوانی ——— چکور

○

صانع کامل کی صنعت کامل ——— خالد

○

کوئی درخت نہیں دیکھا بجز اس کے
جس کی چوٹیاں بادلوں سے اُوپر ہیں

○

میرے دل کے لکیں

○

سمندر کیا اپنی لہریں گن سکتا ہے؟

دنیا کے کسی شاعر، عالم، مفکر، فلسفی اور علامہ سے خالد صاحب کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ خالد صاحب سب سے برتر، سب سے اعلیٰ اور اپنی مثال آپ ہیں

○

صورت ——— من موہنی
سیرت ——— مقناطیسی
علم ——— بے کراں بے پایاں!

○

حضور سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے مدینہ شریف زمین کا عرش ٹھہرا۔ اس مقدس و جلیل القدر خاتون کو کتنے اعلیٰ اور برتر مقامات ملے ہوں گے۔ جس نے ایسا بیٹا پیدا کیا ہے۔

جس کا رونگٹا رونگٹا عشق رسول سے سرشار ہے

اپنا پکاروں خالد　　تیرے سوا میں کس کو؟

○

بلند، وسیع، اتھاہ　　خالد

○

محاسنِ شعرِ خالد

طرفگیِ اسلوب، تکلف بیان، بے ساختگیِ ادا، جدت تراکیب، نازکیِ تصور، شدتِ معنویت، تازگیِ مضامین، حسنِ تخیل، دشوار پسندی، اشکالِ بلیغ، پیچیدگیِ لطیف، رفعتِ تصور، سادگی، روانی، سلاست، تاثر، طنز و تعریض، معاملہ بندی، شکوہ سنجی، رعایت لفظی، محاکات نگاری، تلازمات، فارسی مرکبات، عربیت، دلکش و پرکشش مضامین و موضوعات سوز و گداز، قومیت، وطنیت، محبت، واردات قلبی، علوئے فکر، تعمقِ جذبات، زورِ ادا، تقدیس الفاظ، ثقاہت مذہبی، شوکت خیال، حسن و جمال کی عکاسی۔

○

. . . . . اگر انسان کا ہمزاد حقیقت میں کوئی چیز ہے تو وہ میری رُوح ہے۔ میں ایک ہستی خواب پسند، خیال پرست ہوں۔ ہزاروں میل دور ایک گھر کے گوشے گوشے میں میری رُوح مسرور و مطمئن پھرا کرتی ہے۔ اور کیسے کیسے خوابوں کو میرے لیے تعبیر عطا کرتی ہے۔ کیسے کیسے خیالوں کو حقیقت کا جامہ پہناتی ہے

. . . . . وہ ایک شخصی اور ذاتی کیف ہے۔ سکر و سرور کی وہ کیفیت جس سے ہوش میں آنا نہایت درجہ تکلیف دہ، اذیت ناک اور رُوح فرسا بات ہے۔

○

. . . . . صرف خدا ہی شاہ رگ سے قریب نہیں ہے۔ خدا کا ایک بندہ بھی میری شاہ رگ سے قریب ہے۔

حیران ہوں اسے کیا نام دوں

. . . . . عزیزم! بگو بندہ و مستی کنند۔

○

وہ بندہ خدا ہے خداوند فکر و فن

○

آفتاب کمال ہے خالد — ماہتاب جمال ہے خالد
اس کا ثانی نہیں ہے دنیا میں — آپ اپنی مثال ہے خالد

میں کاہ بکسار ہوں تو کوہ فلک بوس

○

اگر میں ہمہ تن چشم بن جاؤں تب بھی تجھے پوری طرح دیکھ نہیں سکتی۔
اگر میں ہمہ تن گوش ہو جاؤں تب بھی تجھے پوری طرح سُن نہیں سکتی!
اگر میں ہمہ تن دل بن جاؤں تب بھی تیری محبت پوری طرح دل میں سما نہیں سکتی
ایک حقیر و بے حقیقت کوزے میں بحرِ خالد سما نہیں سکتا۔

○

میرا کا گردھر

○

تمنّا تری ہم نشینی کی ہے بس اک ساعتِ مختصر کے لیے

○

چپ آؤ اک دن اچانک

○

میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتی ہوں، آنکھیں بچھا سکتی ہوں میں

○

دنیا کی ہر چیز کا انتخاب ممکن ہے بجز خالد صاحب کے اشعار کے وہ بجائے خود منتخب ہیں

——— خدا یگانۂ جمال و خلاصۂ خوبی ——— عبدالعزیز خالد

ایک پیکر میں سمٹ کر رہ گئیں خوبیاں، رعنائیاں، زیبائیاں

○

وظیفے سب چھٹے اک نام تیرا دعائے شام ہے وردِ سحر ہے

○

ہے سلیمان ملکِ فن خالد

○

ایک میزانِ علم بنایئے۔
جن کے دو پلڑے ہوں
آسمان و زمین کے سے وسیع
ایک حصّے میں دنیا بھر کے اگلے پچھلے اور موجود عالموں اور فن کاروں کو بٹھا دیجئے
اور دوسرے حصّے میں صرف اور صرف تنہا خالد صاحب کو
ایک کو میزانِ علم کو اُٹھائے وہ پلڑا اتنا وزنی ہوگا کہ کسی سے اُٹھ نہ سکے گا۔ جس میں علم و فن کے تاجدار خالد صاحب ہوں گے!

عفت موہانی

ایک آرزو

بولا طبیب جب بھی احوالِ دوست پوچھا
نبضیں چھوٹ چکیں
سانس آنکھوں میں اٹکی ہے
چشمِ انتظار وا ہے
اس کے لیے
جو حسین ہے ۔ مہربان ہے۔ نیک ہے۔
جو دیوتا ہے ، اوتار ہے ۔
وہ آنے والا ہے ۔ وہ آرہا ہے
اور دیکھو وہ آگیا
اس کی مہک ہوائیں لا رہی ہیں
اس کے قدموں کی آہٹیں قریب سے قریب تر ہو رہی ہیں
بیمار محبت نے آنکھیں کھولیں
اس حسین و پُر محبت چہرے کو دیکھا ۔
جو اس پر جھک گیا
۔ دو ساکت ہاتھوں نے محبت بھرے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا

اور پھر

"فی بُعدِہا عذابٌ"

بدل گیا

"فی قُربِہا سلامۃ"   میں

قربِ محبوب وسیلہ بنا قربِ الٰہی کا

روحِ بیمار خرم و مسرور دیدارِ محبوب سے

شاد کام و سرشار عدم کی پہنائیوں میں گم ہو گئی!

خالد اقبال (حیدرآباد دکن)

ع ——— عظیم شاعرِ عربیہ
ب ——— بلند ترین انسانیت کے آئینہ دار
د ——— دنیاداری سے بالاتر و بے نیاز
ل ——— لا اِلٰہ اِلا اللہ محمد رسولُ اللہ کے پرچار میں اٹوٹ محنت کرنے والی عظیم شخصیت

ع ——— عزیز ہی نہیں سب کے ہر دلعزیز
ز ——— ذَرَّۃٍ خَیْراً یَّرَہٗ پر عمل کرنے والے
ی ——— یہ کسی کی داد و تحسین کے نہیں طلب گار
ز ——— زوال جس کی شاعری میں خارج از امکان

خ ——— خدا اور اُس کی مخلوق کے بے لوث خدمت گزار
ا ——— آج کے دَور کو جن کی شدید ضرورت
ل ——— لائے تھے دنیا والے پیغمبروں پہ ایمان جس طرح
د ——— دل یہ چاہتا ہے کہ
لے آئے خالد بھی ایمان
"خالد" پہ

عفت موہانی

"تم نے سارے ادیبوں کو پڑھ رکھا ہے کیا؟"

"جی ہاں!"

"تمھیں کون سا ادیب اچھا لگتا ہے۔ تم بتاؤ۔"

"شفیق الرحمٰن"

"سچی؟"

"جی ہاں!"

"عفت موہانی بھی بہت پسند ہیں!"

اور شاعر ــــ؟ شاعروں میں آپ کو غالب پسند ہیں یا علامہ اقبال؟"

"کوئی نہیں!"

"کوئی نہیں؟" الطاف اُچھل پڑا۔ پھر کون پسند ہیں۔ اسماعیل میرٹھی۔ اور ان کی ــ ایک لڑکی بگھارتی ہے دال دال کرتی ہے عرض یوں احوال مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ ہماری ممی جب ارہر کی دال بگھارتی ہیں تو مجھے وہ تصویر یاد آجاتی ہے۔ چھوٹے سے چولہے پر دال کی ہنڈیا چڑھی ہے اور سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ ہے نا خالہ۔۔۔۔؟"

"ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ جب تم بڑے ہو گے اور تمھارا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا۔ تمھارا ذوق نکھرتا جائے گا۔ تم شاعروں میں موازنہ و مقابلہ کر سکو گے تو تمھیں پتہ چلے گا کہ شعر کی اقلیم کا ایک تاجدار ایسا ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارے زمانوں کا ایک اور اکیلا نابغہ ہے اور وہ۔۔۔۔"

"نابغہ؟" وہ اس کی شکل تکنے لگا۔

"ہاں۔ جینیس۔ سمجھتے ہو۔ جینیس کا مطلب؟"

"جیسا کہ میں ہوں۔" اس نے فخریہ کہا۔ "تو وہ جینیس کون سا شاعر ہے خالہ۔"

"وہ ہے۔ خالد۔ عافیہ کے دہن میں شہد گھل گیا۔" وہ سارے زمانوں پر محیط ہے۔ تم جب بڑے ہو جاؤ گے اور ان کے شعر پڑھو گے تو جھوم جھوم اٹھو گے اور کہو گے کہ نقلی پتھروں کی چمک دمک تو بیکار چیز ہے۔ اصلی کوہِ نور تو وہی ہے۔ تاج شاعری کا جگمگاتا ہوا ہیرا۔"

"آپ کو وہ بہت اچھے لگتے ہیں!"

"میرے پسندیدہ محبوب شاعر۔"

"وہ کہاں رہتے ہیں خالہ؟"

"جو انھیں پسند کرتا ہے انھیں چاہتا ہے۔ وہ اس کے دل میں رہتے ہیں۔"

اور اس نے اپنی نظریں بدر کامل پر جما دیں۔ وہ آہستہ آہستہ پچھم کی طرف جھک رہا تھا۔ اس کے لب گنگنانے لگے ؎

چاند کا زرد مرمریں بجرہ
قلزمِ نیلگوں ڈوب گیا
شعلہ پردیں کا بجھ کے راکھ ہوا
رات بھیگی گریز پا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے
سیج سونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار اے دلِ رسوا

جادو نگار شاعر، تجھے خدا لافانی کر دے۔ تو ہمیشہ حسین نغمے گاتا رہے۔ تو بھی علم و محبت کا چاند ہے۔

(زیب النساء، لاہور)

عبدالعزیز خالد

انسان پرستش پسند ہے۔ ابتدائے آفرینش ہی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر قوم و مذہب میں عقائد کے مطابق خدا، دیوی، دیوتا کا وجود پایا جاتا ہے۔ خدا کی وحدانیت کے ماننے سے پہلے بھی ؎

کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر

انسانی ذہن نے اپنی روحانی تسکین کے لئے بھی پیکر محسوس کی پرستش جاری رکھی ہے۔ اسے آئیڈیل پرستی یا آدرش پسندی کا نام دے لیجئے، ہیرو ورشپ بھی تو یہی ہے۔ جس کی مثال ڈھونڈنے کے لئے کسی انسائیکلوپیڈیا کے اوراق الٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدم قدم پہ ہیرو لپسند مل جاتے ہیں۔ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ آدمی جس کسی کو چاہتا ہو اسے اس کی ہم نشینی کا فخر یا ہم کلامی کا غرور بھی نصیب ہو۔ مفارقت اور دوری انسانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی بشرطیکہ معاملہ یہ ہو ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ میرا جنم اسی زمانے میں ہوا ہے جس زمانے میں ایک تاریخ ساز ہستی جناب عبدالعزیز صاحب خالد بھی خدا کی رحمت و نعمت کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کا مجمل سا تعارف یہ ہے کہ وہ پاکستانی شاعر کہے جاتے ہیں جہاں تک میرے نظریئے کا تعلق ہے۔ کسی شاعر ادیب یا کسی اور منفرد ہستی کو کسی مقامیت تک محدود نہیں رہتی۔ وہ بڑھتی ہے پھیلتی ہے اور باریک سے باریک معدوم سی دراز سے بھی فرش زمین تک پہنچتی اور اس حصۂ زمین کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک منفرد و مجتہد، موجد و مخترع، اور محقق شاعر کے کلام کو ہر صاحب ذوق و صاحب دل تک پہنچنا چاہیئے۔ اچھے کلام کی تبلیغ و اشاعت کا مؤثر ذریعہ یہی ہے!۔

جناب خالد صاحب جتنے مشہور و معروف ارض پاکستان کے لئے ہیں۔ اتنے معروف ہندوستان میں نہیں ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہی تو ہے کہ ہم ایک عجوبۂ روزگار، محیر العقول، نابغہ ہستی سے ناواقف اور اس کے عجیب و غریب کلام سے یکسر محروم ہیں! صرف ایک مختصر سا حلقہ اور خاص خاص حضرات ہی ان سے واقف ہیں۔ جنہوں نے اپنے علم و استعداد کے مطابق خالد صاحب کی بے انتہا تعریف و ستائش کی ہے۔

خالد صاحب دراصل بنیادی طور پر نعت گو شاعر ہیں۔ سب سے پہلا شعر جو اوائل مشق میں انہوں نے کہا تھا وہ بھی نعت ہی کا تھا ؎ اور اس کے بعد متفرق اسالیب سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ سب سے پہلے ان کی تخلیق "رہ رسم منزلہا"

شاہد احمد صاحب دہلوی کے مشہور رسالے ساقی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کے قلم نے کہیں منزل نہیں کی۔ وہ برابر رواں دواں ہے اور قلم کی طاقت و توانائی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ وہ مزید دشوار گذار راہوں پر سفر کرتا چلا جائے گا!

خالد صاحب نے پہلے نعتیہ مجموعہ کلام کا نام فارقلیط ہے۔ یہ سرکار نبی کریمؐ کا اسم گرامی ہے۔ حضورؐ کی مدح میں یہ طویل ترین اور خوبصورت ترین نعت شریف ہے۔ چند اشعار ہیں۔

بیں فرش زمیں ہوں تو سقف سما ہے | بس سانسوں کا مہاں تو موج ہوا ہے
شہنشاہ لولاک و مولائے سدرہ | تو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے
تری ذات فخرِ بنی نوعِ انساں | تو صلِّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے
ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ | تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے

انہی اشعار میں غنائیت اور ترنم کا انداز کتنا مسحور کن ہے۔

کریم السجیۃ جمیل الطویۃ | تو خیرالبریۃ نہ دوسرا ہے

یہ ایک بہت طویل نعت ہے! ــــــ اور اتنی مرصع اور اتنی موثر کہ یوں لگتا ہے الفاظ کا ایک سیل بے پناہ ہے جو شاعر کی محبت و ارادت رسول صلعم کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے!

فارقلیط کے بعد خالد صاحب نے دوسرے نعتیہ مجموعے منحمنّا، طاب طاب، ماذ ماذ، حمطایا اور عبدہ لکھے ہیں۔ یہ نام ایک کم علم یا ذی علم کو بھی نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے خالد صاحب نے متعدّد دوسرے حوالوں سے ثابت کر دیا ہے کہ بڑی موثّر کتابوں میں یہ سب نام حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہیں!

نعتیہ کلام کے علاوہ انہوں نے دوسری اصناف سخن پر بھی توجہ دی ہے۔ مثلاً سراب ساحل جو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ گیتا نجلی، سلومی، لحنِ صریر، زرداغِ دل، اقبال عطیہ، بادِ شمال، پرواز عقاب، کف دریا، دانہ ہائے ریختہ، اور متعدّد دوسرا کلام اسی ضمن میں ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ نظم کیا۔ جو فرقانِ جاوید کے عنوان سے پاکستان کے رسائل میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے بھی اسی قسم کی کوشش کی تھی۔ مگر خالد صاحب کا منظوم ترجمۂ قرآن بلاشبہ ایک کارنامہ ہے!

خالد صاحب اردو شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں وہ ہمہ عصر بھی ہیں اور ہمہ گیر بھی۔ ان کے کلام کا قدما، معاصرین اور متوسّطین کے کلام سے موازنے اور مقابل کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خالد صاحب پچھلے اور معاصر شعراء سے بہت آگے ہیں اور یقیناً مستقبل میں بھی ان سا عالم پیدا ہونا ناممکن ہے۔ دورِ حاضر کے یا قدیم شعراء میں بھی کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جسے عربی فارسی ہندی سنسکرت کے ساتھ ساتھ یونانی، چینی، اگور کھی زبانوں پر بھی ایسا عبور و دسترس حاصل ہو۔ عربی اور فارسی کے وہ سکالر ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر دعوتِ غور و فکر دیتا ہے اور بہت کچھ سکھاتا بھی ہے۔ خالد صاحب نے شاعری کو محدود تخیل، فرسودہ جذبات، اور ناقص پیرایۂ اظہار کے دائرے سے نکال کر پیغمبرانہ عرفان کی نامعلوم رفعتوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان کے شاعرانہ محاسن کا احاطہ بھی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خالد صاحب ہی کا سا عالم فاضل ہو۔ اور فی الحال ہند و پاک میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ اب تک جتنے ضخیم و عظیم خالد نمبر نکلے ہیں۔ اور نجانے سینکڑوں یا ہزاروں لوگ ان کی مدح و ثنا کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب ادھورے اور نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔ اتنے عظیم، رفیع المرتبت، علم و فن کی معراج پر پہنچے ہوئے بے بدل و بے ہمتا شاعر کی کماحقہ تعریف و ستائش کا حق کوئی بھی ثناگر ادا نہ کر سکا!

ان کے علمی تبحر، ان کے بلند و برتر اظہار احساس اور انداز کلام کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لئے بڑا زبردست علم، کافی دقت، اور وسیع مطالعہ درکار ہے۔ ایک مختصر سے تعارفی مضمون میں ان کے کمالات کا جائزہ لینا آفتاب کی کرنوں کو مقید کرنے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل ناممکن ہے!

سمندر کو عمیق، آسمان کو بلند اور صحرا کو وسیع کہہ دینے سے اصلی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ گویا کہ ——— پانی پہ اثر تے نہیں منڈلاتے ہیں!

خالد صاحب لسان العصر ہیں۔ الفاظ کے جادوگر ہیں۔ معلومات کے کوہِ گراں ہیں۔ افلاکِ تخیّل کے بلند پرواز طائر ہیں۔ بحر العلوم کے ماہر غوّاص ہیں۔ لیکن پھر بھی ؎

خالد جو نظر آتا ہے کچھ اس سے سوا ہے

کسی کی صحیح تعریف وہ ہے جو دشمن کرے۔ پہلے پہل خالد صاحب کے مشکل اور ادق اندازِ اظہار پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ انہیں تمسخر و استہزا کا نشانہ بنایا گیا، لیکن وہی معترضین بعد میں مداحین بن گئے۔ مگر خالد صاحب اتنے وسیع الظرف اور ضابط انسان ہیں کہ جب ان پر پتھر پھینکے گئے۔ انہوں نے تب بھی اُف نہ کی۔ اور جب انہیں پھولوں کا مستحق سمجھا گیا تب بھی غرور و تکبّر سے وہ کوسوں دور رہے۔ خاصانِ خدا کا یہی شعار ہوتا ہے۔

جتنی مجلّی ان کی سیرت ہے۔ بے ریا، بے غرض، بے لوث، انتہا سے زیادہ پُر محبت اور مخلص انسان ہیں۔ سیدھے سادے، معصوم، سادگی پسند، اسی قدر وہ حسین و جمیل بھی ہیں۔ اللہ خوبصورتی سے محبت کرتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اپنے ایک عبدالعزیز کو اس نے تمام اعلیٰ صفات سے متصف کر کے اسے انعام میں وہ نعمتیں عطا کر رکھی ہیں جو لاکھوں میں ایک کو بھی شاید ہی نصیب ہوتی ہوں ؎

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کسی انسان میں کوئی ایک خوبی ہو تو آدمی اس کی تعریف کرے یہاں تو صورتِ حال اُسی حدیث کی سی ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ بارش کے قطروں میں پچھلے اچھے تھے کہ اگلے اچھے ہوں گے، نگاہ حیران، عقل گم، اور شعور دم بخود۔ ان کا ہر شعر از دل ریزد و بر دل خیزد کی مثال ہے۔ کسے اچھا کہیئے کسے بہت اچھا۔؟

خالد صاحب کی بندہ نوازی اور خلوص کیشی کی یہ روشن مثال ہے کہ انہوں نے مجھ بے قسمت بے بضاعت اور ذرّہ ناچیز کو بھی اپنی توجہ اور محبت دے رکھی ہے۔ بھلا وہ کہاں اور میں کہاں عرش و فرش کی بات ہے۔ میں کاہِ سبکبار ہوں وہ کوہِ فلک بوس۔ لیکن میرے لئے یہ اعزاز کتنا قیمتی ہے کہ ان کے خط مجھ بے نام کے نام آتے ہیں۔ اپنی دو کتابوں کا انتساب انہوں نے مجھ بے نوا کے نام کیا ہے۔ مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرا دماغ اتنا چھوٹا، میرا علم اتنا محدود و ناقص اور میرا ذخیرۂ الفاظ اس قدر معدوم و مبہم ہے کہ میں پوری طرح خالد صاحب کی محبت، اخلاص، التفات، اور توجہ کے لئے کسی صورت اپنی نیازمندی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ یہ حسرت ہے ؎

جو میرے دل میں ہے کیونکر ہو بیاں

یا پھر یہ افسوس ہوتا ہے ؎

پیکرِ حرف میں کس طور ڈھلے جذبِ نہاں　　میرے بس میں ہے فقط ان سے محبت کرنا!

اس وحید الدہر شاعر کے چند اشعار دیکھئے کہ سمندر سے گویا میں بھرتی ہوں گھونٹ۔

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے　　اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

میری اک عمر تجھ سے وابستہ　　میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں

تو مرے خندۂ مسرور و مطمئن پہ نہ جا
اِک آرزو مرے پہلو میں سوگوار بھی ہے

خالد! طیبی ذکرِ حبیبی
لب پہ مسلسل صلِّ علیٰ ہے

لکھنے والے نے عمر بھر کے لئے
میری قسمت میں رتجگے لکھے

طلوعِ ازل سے غروبِ ابد تک
میں راہِ غمِ آرزو کا مسافر

یہ دنیا نمود کی ہے یہاں
خلوص و وفا کا نام کہاں

بہر حال یہ چند اشعار لاکھوں اشعار میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی سمندر کے چند قطرے۔ اور کلام کا انتخاب آسان کام نہیں ہے!
یہ چند سطریں۔ چار چھ شعر میرے جذبات محبت و ارادت کا خفیف سا عکس ہیں۔ اور جذباتِ فراواں کے اظہار کے لئے میرے پاس نہ الفاظ ہیں۔ نہ موزوں پیرایۂ اظہار۔
شعر کا مصنف کتابوں میں چہرہ نما ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ایک عمر اور ساری عمر کا علم بھی ناکافی ہے!

فارقلیط کا شاعر

۱۹۶۶ء میرے لیے ایک اہم اور یادگار سال ہے۔ جس نے میرے ناقص افکار اور سطحی محسوسات کا دھارا ایک روشن مستحکم اور اعلیٰ رُخ پر موڑ دیا۔ ساتھ ہی میری ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل بھی اسی سال کی دین ہے!۔

یوں تو کتب بینی اور مطالعہ کا شوق مجھے بہت شروع سے ہے۔ ابھی اسکول جانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ میں نے اُردو کی بہت سی نظمیں اور انگریزی کی پوئمز یاد کر لی تھیں۔ اقبال کی وہ نظمیں جو بچّوں کے لیے ہیں۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کا شکوہ جواب شکوہ، مسجد قرطبہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، کے چند شعر ازبر تھے۔ حالی کی مسدّس، چکبست کا رامائن کا سین، انیس کے کچھ مرثیے، اور جانے کیا کچھ یاد کر لیا تھا۔ جس پر مجھے فخر بھی تھا۔ پھر مدرسہ کی شکل دیکھی۔ وہاں سے کچھ سیکھا، مدرسہ کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی نوبت آئی۔ میری پسند بدل گئی، معیار بدلنے لگا۔ مجھے احساس ہُوا کہ یہ جو اتنا بہت سا ملغوبہ اشعار کی صورت میں میرے دماغ میں بھرا ہے۔ وہ کسی قابل بھی ہے۔ اس احساس کے ساتھ مجھے کسی آئیڈیل کی تلاش رہنے لگی۔ تشبیہہ بہت بڑی ہے۔ لیکن میرے ذہن میں یہی تشبیہہ آتی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم نے پہلے پہل مظاہر قدرت میں اپنا خدا تلاش کیا تھا۔ اور اس جویائے حق نے بالآخر اپنا پروردگار تلاش کر ہی لیا تھا۔ میں نے بھی ہر زبان کے ادب میں اپنا منتہائے ذہن ڈھونڈا تھا۔ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی تو میرے نصاب میں شامل زبانیں تھیں۔ اردو کا تو تذکرہ ہی کیا۔ اپنی دانست میں، میں نے سب پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ کم فہمی، لاعلمی اور جہالت کی انتہا تھی۔ لاعلمی کی دلیل شعورِ علم۔

نامکمل اور ٹوٹا پھوٹا سا لکھنا بھی میں نے بچپن ہی سے شروع کیا تھا۔ لیکن اب پرانی نہج کی شاعری سے جی اُکتا گیا تھا۔ جدیدیت نے ابہامی شاعری کی بکواس نے دماغ کی چولیں اور خراب کر دیں۔ ابہام مجھے چیستاں لگتا ہے۔ اچھا بھی نہیں لگتا۔ اسی زمانے میں جبکہ میں نے شاعروں کا کلام پڑھنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ اتفاقیہ طور پر ایک نیا نام پاکستانی رسائل میں دیکھا۔ ایک نئی آواز سنی، یہ بتانا میرے لیے بہت مشکل ہے کہ اس نئی سحر کن آواز نے میرے دل و دماغ پر کون سا اثر مترتب کیا تھا۔ مجھے تو بس یہی محسوس ہوا تھا کہ غیر شعوری طور پر مجھے اس آواز، اس لحن، اور اسی خوبصورتی کا انتظار تھا۔ جیسے میری تلاش مکمل ہو چکی تھی۔ پھر مجھے رسالوں میں اُسی نئے نام کو دیکھنے اور اس نئے کلام کو پڑھنے کا

بے چینی سے انتظار رہنے لگا۔ (لفظ "نیا" میں نے اپنی لاعلمی کے اظہار کے طور پر لکھا ہے۔ حقیقت میں آفتابِ شعر مطلعِ شعر و ادب پر بہت دنوں سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے ہی دیر میں دیکھا۔) یہ صرف میری بے چینی اور اضطراب کا قصہ نہیں ہے۔ یہ نئی آواز جس رعب و داب، جس وقار و شان، اور جس لب و لہجہ میں اُبھرتی تھی۔ اور شعر کے پورے ماحول پر آناً فاناً چھا گئی تھی۔ اس نے ہزاروں ذہنوں کو متاثر کیا اور ہر قسم کے اہلِ قلم کو چونکا دیا تھا۔ کون تھا جو اس آواز کی طرف متوجہ نہیں ہو گیا تھا!

اور یہ نام و کلام تھا جناب عبدالعزیز صاحب خالد کا۔ اور آج کون شخص ایسا ہے۔ جو اُن سے واقف نہیں ہے؟ اور تب میں نے بھی حضرت ابراہیم کی اصنام شکنی کی طرح اپنے تیشۂ نفی سے پُرانی شاعری کے بُت (اپنی حد تک) توڑ ڈالے۔ اپنا ایک پروردگارِ شعر بالآخر تلاش کر ہی لیا۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے بھی اکثر لوگوں نے تنقید کے الاؤ میں جھونکنے کا مستحق سمجھا۔ لیکن وہ الاؤ بھی میرے لیے مسرت و بہجت کا گلزار بن گیا۔ کیونکہ میرے اپنے خدائے سخن نے اس آگ کو مجھ پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈا ہونے کا حکم دے دیا۔ اپنی محبت، تائید، حمایت اور پشت پناہی کے ذریعہ۔ پھر مجھے پرواہ ہی کس کی رہ گئی تھی؟

یہ نیا کلام بھی خالد صاحب ہی کا تھا۔ جو قدیم روایتی شاعری سے بالکل الگ اور منفرد تھا۔ اس میں نہ تو ہجر و وصال کی بکواس تھی۔ نہ لب و رخسار کی تعریف میں قصیدے تھے۔ نہ شمع و پروانہ کی بے اعتنائی و قربانی کی داستان تھی۔ نہ دیر و حرم کے قصّے تھے۔ نہ تو حسن و عشق کی کہانیاں تھیں۔ وہاں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ جس سے اُردو و فارسی اور جانے کون کون سی زبانوں کی شاعری ابھی تک ملوّث چلی آ رہی ہے۔ بلکہ وہاں تو کچھ اور ہی تھا۔

خالد صاحب کائناتِ شعر میں اپنا الگ اسلوب، اپنا منفرد لہجہ، نیا موضوع، اور سب سے جُدا باوقار اور بارعب اظہار کا طرز لے کر آئے۔ وہ خدائے سخن و پیغمبرِ شعر ہیں۔

ان کا اچھوتا، حسین، اور مسحور کُن کلام پڑھ پڑھ کر مجھے حسرت ہوتی تھی۔ وہ وقت کب آئے گا جب میری بے معنی بے ربط، اور کم سواد تحریر کے ذریعہ میرا ہدیۂ عقیدت و ارادت ان کی خدمت میں پیش ہو سکے گا؟ کتنی دفعہ میں نے قلم ہاتھ میں لیا اور رکھ دیا۔ کتنی مرتبہ خیالوں کے طوفان میرے دماغ میں اُمڈے، لیکن کسی ایک معمولی سے خیال کو بھی الفاظ کی زبان نہ مل سکی، اپنے قلبی احساسات کو موزوں الفاظ کا جامہ پہنانا مجھ سے کبھی ممکن نہ ہو سکا!

اب میرا یہی کام رہ گیا تھا کہ خالد صاحب کے کلام کے جواہر ریزے مختلف رسائل سے اکٹھا کر کے اپنے شعری سرمائے میں اضافہ کیا کروں۔ آج بھی ان کے کلام کے بے شمار تراشے ایک خزانے کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ منظوم ترجمہ کلامِ پاک (فرقانِ جاوید) کے اوراق ان میں شامل نہیں ہیں۔

رفتہ رفتہ میری عقیدت، ارادت اور محبت کی انتہا یہ ہو گئی کہ جب تک ان کا کوئی کلام نہ مل جاتا۔ قرار نہ آتا تھا۔

ادھر اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے بھی دل بے چین تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اکثر خیال آتا کہ اگر میں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے معمولی الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیا تو کیا خالد صاحب کے لیے قابلِ اعتنا ہو گا! بھلا وہ کہاں اور میں کہاں۔ عرش و فرش کا فاصلہ تھا!۔

کسی نے کہا ہے ؎

دُعائے قلب کبھی بے اثر نہیں ہوتی

اور میری شب و روز کی خاموش دُعائیں ۱۹۶۶ء میں قبول ہوئیں۔

خالد صاحب نے پہلی بار مجھے اپنا نعتیہ کلام فارقلیط بھجوایا تھا!

تحفہ لاقیمت تھا۔ اور ذرّہ نوازی کے لیے جس خلوص سے بھیجا گیا تھا۔ اس کی تہہ تک پہنچنا مجھے ابھی تک نصیب نہ ہُوا۔ شکر گزاری، احسان مندی، خلوص و محبّت، بندہ پروری اور یاد آوری کی بے پناہ مسرتوں کی ایک طغیانی سی ذہن میں آگئی تھی۔ جس میں مجھے ڈوبنا اُبھرنا پڑا۔ اور اپنے ہیجان پر قابو پائے بغیر اُن کی خدمت میں جو پہلا عریضہ میں نے بھیجا تھا۔ اس کی یاد ابھی تک مجھے بے پایاں مسرّت بخشتی ہے۔

میں نے اکثر شعراء کا نعتیہ کلام پڑھا ہے۔ لیکن خالد صاحب کا ضخیم نعتیہ کلام فارقلیط پڑھا تو پھر اس کے سامنے پچھلے سارے چراغ گُل ہو گئے!۔

نعت گوئی کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ موضوعِ نعت جس قدر اعلیٰ و برتر ہے۔ شاعر کے جذبات بھی اسی لحاظ سے بلند، تقدّس آفریں اور باادب ہوں۔ اس میدان میں قدم رکھتے تقریباً بھی نعت گو حضرات ڈرتے اور جھجکتے رہے ہیں۔ اس ذاتِ بے ہمتا کی تعریف بھلا فانی و خاکی انسان سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ جو دعائے خلیل و نوید مسیحا ہے۔ جو خدا کے بعد سب سے بزرگ ہے۔ جسے خدا نے اسمہ احمد لکھا اور تاکید کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

نعت کہنا نہایت ذمّہ داری کا کام ہے۔

خود خدا اُس سے کہے انت نبیٌّ مُرسَل

اب قیاس اس سے کرو مرتبۂ عالی جاہ

جن کے لیے کہا گیا ہے کہ اگر دنیا کے سارے درخت قلم بن جائیں اور دنیا کے سارے سمندر روشنائی بن جائیں تب بھی حضورؐ کی تعریف و ثناء کما حقہٗ ممکن نہیں ہے۔

عربی فارسی اور اُردو زبان میں بہت سی نعتیں ملتی ہیں۔ ہر شاعر نے تبرّکاً نعت ضرور کہی ہے۔ لیکن یہ کہنے میں

مجھے کوئی باک نہیں کہ نعتیہ شاعری کے سارے سرمائے میں اگر کوہِ نور کوئی نعت ہے تو وہ خالد صاحب کی ضخیم نعت "فارقلیط" ہے!

اُنھوں نے اس سلسلے میں بلا مبالغہ قدما، معاصرین اور متاخرین کو بھی اپنے بہت بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ متاخرین کو اس لیے کہ اب رہتی دنیا تک کوئی دوسرا متبحر عالم، کوئی دوسرا بحر العلوم، کوئی دوسرا خدائے سخن، کوئی دوسرا پیمبر شعر اور کوئی دوسرا عبد العزیز خالد پیدا نہیں ہو سکتا!

فارقلیط یونانی لفظ پیریکلیوس کا معرب لفظ ہے۔ اور خالد صاحب کی تحقیق کے مطابق۔

نام ختم الرسل انجیل میں ہے فارقلیط
ہے یہ منجملۂ اسمائے رسولِ مقبول

شاعر کو بالعموم تلمیذ الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک خالد صاحب کے عشق و محبتِ رسولؐ کا معاملہ ہے۔ خالد صاحب تلمیذ النبی ہیں۔ بحرِ علم کے غواص تو وہ بے شک ہیں۔ لیکن حضور سرورِ کائناتؐ کی محبت میں وہ اتنے ڈوب چکے ہیں۔ اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار اتنے مخلصانہ، تہہ دار، معنی خیز، تاثر انگیز، رقت خیز، اور محور کن انداز میں کرتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ بجائے خود بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہیں اور حضورؐ کو دردِ دل سُنا رہے ہیں!

اس ضمن میں صرف ایک مجموعۂ نعت فارقلیط پر کیا منحصر ہے۔ ان کی اور نعتیہ کتابوں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں مثلاً منمنا، طاب طاب، ماذاذ، حمیا طا اور عبدہٗ۔ یہ سارے اسمائے حسنیٰ ایک عام قاری کے لیے نامانوس ہیں۔ لیکن خالد صاحب جو ایک بڑے محقق بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد عربی اور فارسی اور اکثر جگہ انگریزی حوالوں سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سارے نام رسولِ مقبول کے ہی ہیں۔ جب ایک قاری ان سے روشناس و متعارف ہو جاتا ہے تو خالد صاحب کے معیارِ تحقیق پر حیران رہ جاتا ہے۔ کہ اس متن کی تفصیل کے لیے انھیں کون کون سی کتابوں کے کتنے اوراق اُلٹنے پڑے ہوں گے!۔

شاعر کی ہستی میں چند در چند عظمتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ ہر زمانے اور ہر قوم میں ایک نہ ایک جینیس پیدا ہوتا ہے اور کوئی کارنامہ انجام ضرور دیتا ہے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ اس زمانے میں ہم سب کو خالد صاحب کا سا نابغہ بے بدل خدا نے عطا کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر فارقلیط ہی کو سامنے رکھا جائے تو دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کارنامہ جو خالد صاحب نے انجام دیا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں، ایک آہنگ، ایک لے، اور ایک ہی سلسلے میں مسلسل پندرہ سو بیس (۱۵۲۰) شعر کہنا یقیناً ایک مہتم بالشان کارنامہ ہی ہے۔

خالد صاحب کا کلام پڑھتے ہوئے ایک اہم بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ وہ غیر معمولی ذہن و فکر کے

مالک، کئی زبانوں کے عالم اور بلند شاعر ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کے لیے آدمی کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے۔

فارقلیط کا موضوع جتنا مقدس، متبرک اور بلند و برتر ہے۔ اسی کے مطابق شاعر نے پُرشکوہ الفاظ، بارعب و باوقار پیرایۂ اظہار، اور غیر معمولی طرفگیٔ ادا کے ذریعہ اپنی وسعتِ علمی اور قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال اس حدیث کی سی ہے کہ شعر پر شعر پڑھتے جایئے اور قوتِ فیصلہ مبہوت رہ جائے کہ کون سا شعر بہتر اور کون سا شعر بہتر بن ہے۔ کم سے کم میرا تاثر یہی رہا ہے کہ ایسی عمدہ، پُرکشش، بلند اور معنیٰ آفرین کتاب میں نے عمر بھر میں صرف یہی ایک پڑھی ہے۔ میں نے فارقلیط کا مطالعہ بے گنتی مرتبہ کیا ہے اور ہر مرتبہ شاعر کے دل کے ساتھ میرا دل بھی پکار اُٹھا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت میں شاعر اتنا سرشار اور بے خود ہے کہ اظہارِ احساس کے لیے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ وہاں تو بےبسی اور عاجزی ہی کا سہارا لیا جا سکتا ہے ؎

کہاں ہو سکے تیری مدحت سرائی
ثریا کو دستِ بشر نے چھوا ہے

اس پر بھی خالد صاحب نے اس بات کی سعی کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل مبارک، کردار و گفتار اور اقوال و تعلیمات کا کوئی گوشہ نظم ہونے سے رہ نہ جائے۔ کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے

اپنی زندگی میں میں نے لاکھوں شعر پڑھ ڈالے ہیں لیکن "سقفِ سما" کی خوب صورت ترکیب پہلی دفعہ فارقلیط ہی میں پڑھی۔ اور اس کے بعد پھر کہیں اور نہیں دکھائی دی۔!

شمائلِ رسولؐ کی اثر آفرینی، حسن و خوب صورتی کا مسحور کن اور دلنشین انداز کچھ یہ ہے ؎

رُخِ صبح سے پوچھا جو تیرا تو بولیں
سمجھ لو کہ مشرق سے دن چڑھ رہا ہے

حسن و جمالِ نبیؐ کی فن کارانہ اور والہانہ مدحت سرائی اس پیرایہ میں ہے ؎

چمکتی ہے بجلی سی ابرِ سیہ میں
ترا چہرہ زلفوں میں کو دے رہا ہے
تجلّی سے چہرہ ترا ارغوانی
تو خورشیدِ روز و مہِ چاردہ ہے
ہے چشمِ حیا دستگہ نجمِ ثاقب
رُخِ دلربا صبح کا کوکبہ ہے

کنارہ شفق میں لڑی موتیوں کی
گلِ نودمیدہ لبوں پر فدا ہے
ترا چہرہ مصحف کا زرکار ورقہ
تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے؟
نشیلے کنول نین کجرارے تیرے
چھپا کر نظر دل تجھے دیکھتا ہے
شہابی بدن زیب تن سُرخ جوڑا
کنول آبِ شفّاف پہ تیرتا ہے
نہیں نرم تر تیرے ہاتھوں سے ریشم
اَنسُو کہہ رہا ہے جو لمس آشنا ہے
سراپا ستودہ سراپا محمّد
کسے اس کی تعریف کا حوصلہ ہے
وہ تعبیر خوابِ خداوند خالق
وہ نقشِ ہیولائے ارض و سما ہے

سراپائے رسولؐ کا تذکرہ نظم ونثر میں کس نے اتنے مؤثر و خوب صورت انداز میں پڑھا ہوگا؟
ہندی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں "محبوب" معکوس ہے۔ اور اسی لیے یہ شاعری شیریں سمجھی گئی ہے۔
حضورؐ سے دوری، اور اس دوری کے اذیت ناک احساس کا اظہار کتنی خوبی سے کیا ہے۔

کہوں کس سے دکھ دیرہ ہے چین ویری
تمہارے محبت میں دل ہر گیا ہے
میں شبدوں کی پیاسی میں چرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے
میں جوگن بروگن میں کملی کمینی
تو سرتاج میرا، مرا دیوتا ہے

ہندی کی عورت جو اپنے محبوب کا خود سے تقابل کرتی ہے اور اپنے آپ کو اس سے کہیں کم درجہ کہتی ہے۔

تو دیپک میں کاجل تو درپن میں سیسہ
میں کالک تو پربھات کی لالما ہے
میں لوہا تو پارس میں کنکر تو ہیرا
میں مٹی کی گڑیا تو ابرو ہوا ہے

آنحضرتؐ صادق و امین ہیں۔

سحر کی طرح صادق الوعد ہے تو
جو ذمہ لیا اس کو پورا کیا ہے
شریک تجارت ترا قیس سائب
تجھے آشکارو نہاں دیکھتا ہے

خالد صاحب نے فار قلیط میں کئی جگہ تلمیحات بھی استعمال کی ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ مبارکہ سے واقفیت حاصل کی جائے۔
مثلاً

فضالہ کے سینے پہ دستِ مبارک
جو قاتل تھا پل بھر میں عاشق بنا ہے

مذہب اسلام کے منکر اور داعیٔ اسلام کے دشمن مکہ میں بہت سے تھے۔ ان کی کوششیں ہمیشہ یہی رہتی تھیں کہ سرکارؐ کو کسی طرح جسمانی گزند پہنچایا جائے۔ فضالہ بھی انہی دشمنانِ اسلام میں ایک تھا۔ ایک مرتبہ وہ حضورؐ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کعبہ کے آس پاس پھر رہا تھا۔ حضورؐ نے وجہ پوچھی۔ فضالہ نے جواب دیا۔ یا رسولؐ اللہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ فضالہ کا بیان ہے کہ حضورؐ کا ہاتھ میرے سینے پر آیا تو ایک ٹھنڈی سی سینے میں اُتر گئی۔ اور پھر "خدا کی قسم مجھ سے بڑھ کر حضورؐ کا کوئی دوست نہ تھا"
دوسری مثال یہ ہے۔

کبھی اُس نے دیکھا نہ تھا ایسا منظر
اُٹھا تو تو غورث کھڑا کانپتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے استراحت فرما تھے۔ غورث تاک میں تھا کہ اپنی تلوار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور پہنچا سکے۔ اتنے میں آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔ غورث نے تلوار بلند کر کے کہا۔ اب آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ "اللہ" یہ سُن کر غورث کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر گئی۔ اور وہ کانپنے

لگا! آپ نے تلوار اُٹھالی اور کہا۔ اَب تجھے کون بچا سکتا ہے؟

غورث نے جواب دیا۔ اللہ کا رسولؐ

ایسی تلمیحیں کتاب میں اور بھی ہیں۔ اور بجائے خود معلومات کا خزانہ ہیں۔

فارقلیط کے بے مثال شاعر نے صرف اپنی محبت ہی کے چند جذبوں سے اشعار کو نہیں سنوارا۔ ان میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ دورِ جہالت کی عکاسی ہے۔ مکہ کی شہری زندگی کی نقشہ کشی ہے۔ ولادت و بعثتِ رسولؐ کا تذکرہ بڑے دل نشین پیرایہ میں ہے۔ اس عظیم انقلاب کا ذکر ہے جو اسلام کے دنیا میں آنے کے بعد رونما ہوا۔ ان سب پر شاعر کی محبت نبویؐ مستزاد ہے۔ غرض یہ کہ فارقلیط ایک ایسا شاندار، مثالی، عظیم الشان اور تحیر خیز شعری کارنامہ ہے کہ اس کے لیے خالد صاحب کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے۔ جتنی تعریف و ستائش کی جائے، کم ہے!

خالد صاحب نے ایک آہنگ میں پورے پندرہ سو بیس اشعار لکھ دیئے ہیں اور پھر بھی انھیں یہ احساس ہے کہ

قلم بند ہو کس طرح کلکِ نے سے
بیاں تیرے حسنِ کلو سوز کا ہے
کہاں نعت و نامِ رسولؐ تہامی
کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

فارقلیط کے شاعر کے سینے میں عشقِ نبیؐ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ جسے اضمحلال، فنا اور موت نہیں!

فارقلیط کی بحر اتنی مترنم ہے کہ ایسا لگتا ہے۔ ہر شعر نغمہ بار ہے۔ ان میں کوئی ساز پوشیدہ ہے۔

کریم السجیہ جمیل الطویہ
تو خیر البریہ شہ دوسرا ہے
سُن اے فاطمہ میری پھولوں سے بیٹا
یہ سونے کا کنگن کڑا آگ کا ہے
چلے تو تو خوشبو چلے آگے آگے
بدستِ صبا مجمرِ غالیہ ہے
بدن سیم سارا ہے دل سنگِ خارا
کسی مرد آہن کی رہ تک رہا ہے
رہوں رات دن میں ترے سنگ تیاں
مری روشنی ہے تو میرا دیا ہے

میں نہ دان پیغمبر کے دشمن کو ترسوں
مری ہر سحر شام گاہ عزا ہے
میں ہوتا تو وہ پاؤں دھو دھو کے پیتا
جو مشروب رحمت ہے آبِ بقا ہے
وہ انیارے رتنارے متوالے نیناں
جنہوں نے مرے دل پہ جادو کیا ہے

فارقلیط خالد صاحب کی بڑی مہتم بالشان تصنیف ہے۔ اس کی تعریف جیسی کرنی چاہیئے میں اس سے قاصر ہوں۔ ان کی عالمانہ و فاضلانہ بصیرت و کمالات کا احاطہ اگر کسی کے بس کی بات نہیں ہے تو ان کی فرشتگانہ سیرت کی حصار بندی بھی آسان کام نہیں۔ وہ گوناگوں خوبیوں اور بہتیری خوب صورتیوں کا حسین و دلکش پیکر ہیں!۔

میرا احساس تو یوں فرحت و مسرت سے بر یز ہے کہ خالد صاحب کے ہزاروں پرستاروں میں ایک کم سواد، کم علم، اور بے بضاعت پرستار میں بھی ہوں!۔

مثنوی معنوی کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے۔ غالب کے دیوان کو آسمانی کتاب کا درجہ دیا گیا ہے۔ مسدس حالی کو سرسید نے اپنی نجات کا ذریعہ جانا ہے۔ اور یہ سب چیزیں بلا مبالغہ و بلا شبہ فارقلیط سے کم ہیں۔ فارقلیط عشقِ رسولؐ کے سلسلے میں جذبوں کا ہمالیہ ہے۔ اپنی حمد و ثنا کرنے والے شاعر کو رحمۃ للعالمین ہی بڑا انعام فرما سکتے ہیں، شہرت و مقبولیتِ دوام کا انعام۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وحی کا نزول اگر ممکن ہوتا تو خالد صاحب کو بھی فارقلیط لکھنے پر عشرہ مبشرہ کی طرح دنیا ہی میں جنت کی بشارت نہ مل جاتی!۔

پیغمبر کہے اِنّی لستُ بشاعر
کہ یہ مرتبہ میرے مملوک کا ہے
کہ میں کہتا ہوں خالد
جو سلطانِ اقلیم حرف و نوا ہے

۶۷ء

ہر پاکستانی رسالے میں ایک پُرکشش نام بار بار نظر آ رہا تھا۔ نام جتنا اچھا تھا کلام بھی اسی قدر مسحور کن، مؤثر، نیا اور حیرت خیز تھا۔ جو خود بخود اپنی طرف توجہ کھینچ رہا تھا۔ میری نظریں اس نام کی متلاشی رہتی تھیں۔ اس کلام کی میں شیدائی تھی۔ جو دنیا بھر کے شاعروں کے بوسیدہ، فرسودہ اور روایتی کلام سے بالکل الگ تھا۔ اپنی ایک شان رکھتا تھا۔ اس کا ایک رعب تھا۔ وقار تھا۔ حسین و خوبصورت تھا۔ اس کلام میں ایک خاموش گھن گرج تھی۔ ایک ایسی آواز جو سارے شعرائے متقدمین، متوسطین اور متاخرین پر حاوی ہو گئی۔ اس شاعری نے مجھے بے انتہا مسحور و متاثر اور مرعوب کر دیا۔ میرا بے حد جی چاہنے لگا۔ میں اس شاعر بے ہمتا کو ایک خط لکھ کر اپنا خراج تحسین و ارادات ادا کروں۔ ہزاروں الفاظ ذہن میں ہلچل مچاتے تھے۔ لیکن قلم کی زبان پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے۔ ان الفاظ میں جان اور طاقت ہی کیا تھی۔ جو میرے جذباتِ محبت و عقیدت کا بار اُٹھا سکتے۔ یا پھر میرے محسوسات کو ڈھنگ سے ادا بھی کر سکتے۔ دل کی لگی ہی تو تھی کہ میں بار بار خط لکھتی۔ اور الگ رکھتی گئی۔ بھجوانے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ علم و فضل کے بحرِ ذخار کے آگے بھلا میں اپنا ننھا سا بے حقیقت کوزۂ جہالت کیا رکھ دیتی۔ لیکن دل میں اُٹھنے والے طاقت ور جذبوں کے آگے بند باندھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ شرم بھی بہت آتی تھی۔ کیا سوچے گا وہ "شہنشاہِ علم" یہ کون دریوزہ گر ہے؟ ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا کاسہ لے کر میرے در پر کیوں آئی ہے۔ کیا چاہتی ہے؟ تب میں کیا جواب دے سکتی؟ اس دربار و دربار میں باریاب ہونے کا شوق فراواں مجھے اپنے ساتھ بہا کے لیے جا رہا تھا۔ تب صبر و برداشت کی تاب ختم ہو گئی۔ میرے لیے بزرگوں سے اجازت لینے کا مرحلہ بھی بڑا سوہانِ روح تھا۔ ابا سخت گیر تھے۔ چچا ان سے دو ہاتھ اور سخت گیر تر۔ ان کی نظروں سے نظریں چار کر کے کسی کو خط لکھنے کی اجازت مانگنا بڑا دشوار کام تھا۔ مجھ سے ناممکن۔ امّی سے اجازت لینا بھی کارے دارد۔ ان کا حتمی نظریہ تھا کہ میں مردانہ کالج میں رہ کر نہایت خود سر، ضدی اور اپنے کہے کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ چولہے چکی سے مجھے واسطہ نہیں ہے۔ سینے پرونے سے وحشت ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ سرال جا کر امّی کے نام کو لیمینیٹ کراؤں اور میں کسی مصرف کی نہیں ہوں۔ لڑکیوں کو سر جھکا کے رہنا چاہیے۔ لڑکیاں بھلا کہیں سر اُٹھائے رہتی ہیں۔ امّی سے اجازت لے کر سننے والی باتیں کون سنتا؟ البتہ پھوپھی جان بہت اچھی تھیں۔ انھیں بھی ادبیت سے لگاؤ تھا۔ انھیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اُن کے والد بھی شاعر تھے، اس لیے۔ امّی کے والد ضلعدار تھے۔ اور ادبی ذوق رکھتے تھے کہ نہیں پتہ نہیں۔ نہ میں نے دادا کو دیکھا نہ نانا کو۔ بہرحال اس وقت جبکہ ایک دشواری آ پڑی تھی۔ حلّ المشکلات ذات پھوپھی جان ہی کی دکھائی دی۔ انھیں بھی میں نے شاعر کا کلام سنا سنا کر ان کا گرویدہ کر دیا تھا۔ ان سے میں نے اجازت لی۔

"پھوپھی جان میں نے اول جلول سے خط تو بہتیرے ایڈیٹروں کو لکھے ہیں۔ اب ایک اچھا سا خط خالد صاحب کو بھی لکھنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے بہت بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ نے سنے نہیں ان کے شعر کتنے پیارے، کتنے من موہنے ہوتے

ہیں۔ میں فقط اپنی پسند کا اظہار کروں گی اور بس!"

پھوپھی جان نے فوراً جواب دیا: "نہیں نہیں! مردوں کو خط لکھنا اچھی بات نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم کو اس نے لکھا ہے ویسے نجانے کتنوں کو لکھتی رہتی ہے۔ وہ لوگ اس طرح خط لکھنا اچھا نہیں سمجھتے!"

میں نے تاویل پیش کی۔ "لیکن خالد صاحب یوں غلط سلط سوچنے سمجھنے والے نہیں ہیں۔ وہ بے حد شریف انسان معلوم ہوتے ہیں!"

پھوپھی جان نے کہا "تب تو انھیں خط لکھنا اور بھی بُری بات ہے۔ شریف آدمی اس طرح کی خط و کتابت کو اور بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ خالد صاحب کیا سوچیں گے۔ کیسی آزاد خیال لڑکی ہے جس نے خط لکھ مارا ہے!"

میری ساری خوش رنگ اُمیدوں کا خون ہو گیا۔ ایڈیٹروں کو خط لکھنا ایک الگ بات تھی۔ اور خالد صاحب جیسی کوہ وقار ہستی کو خط لکھنا بالکل ایک دوسری بات

سیف اللہ خالد کی طرح عبدالعزیز خالد اہل قلم۔ ایسے طمطراق، ایسے رعب و دبدبہ، اتنی آن بان سے میدان شاعری میں اُترے تھے کہ ہزاروں کی نظریں ان پر پڑنے لگی تھیں۔ ان میں معترضین بھی تھے اور مداحین بھی۔ مداحوں کی تعداد پھر بھی اعتراض کرنے والوں پر غالب آگئی تھی اور وہ شاعر کی شخصیت اور فن کا اپنی استعداد کے مطابق جائزہ لینے لگے تھے۔ ان کے کلام پر تبصرے اور تنقیدیں شروع ہو چکی تھیں۔ ہر چھوٹا بڑا اپنی علمی بضاعت کے بھروسے خالد صاحب پر کچھ نہ کچھ لکھنا باعث فخر و مسرت سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک محترمہ نسرین حبیب نے بھی "شاعروں کا شاعر" کے عنوان سے خالد صاحب پر مضمون لکھا۔ اور اپنی عقیدت اور مدحت سرائی کے جوش میں خدانخواستہ خالد صاحب کی کُرسی غالب اور اقبال کے برابر بچھادی۔ بلکہ پیش گوئی کر دی۔ کہ غالب و اقبال کے برابر جو تیسری کرسی بچھنے والی ہے۔ وہ خالد صاحب کی ہے۔

یقیناً نسرین حبیب کا منشاء کسی بدنیتی پر مبنی نہ تھا۔ وہ خالد صاحب کا بُرا ابھی نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے ایک موہوم سی تقریب بہر ملاقات بہر حال مل گئی۔ ان کے ان ہی الفاظ کو بہانہ بنا کر میں نے ایک خط لکھا اور رسالہ "جام نو" میں چھپوا دیا۔ اس کے بعد میرا یہ عالم تھا کہ

نہ دن کو چین میسر نہ رات کو راحت

یہ خط خالد صاحب کی نگاہ سے گزرے گا کہ نہیں؟ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ انھیں اس خط کو پڑھنے کی فرصت بھی ملے گی؟ کیا وہ اتنی معمولی بات پر توجہ کریں گے یہ کون سی میری نئی ثنا گر ہے؟

کیا وہ مجھے قابل اعتنا سمجھیں گے؟ ان کے تو لاکھوں پرستار ہیں۔ ان میں میری معدوم و موہوم سی ہستی بھلا کیا؟

لیکن

ع وہ بندۂ خدا کہ خداوند فکر و فن

جس نے اپنی محبت و شفقت، توجہ و التفات اور بندہ نوازی سے میرے بختِ خفتہ کو بیدار کر دیا۔ مجھے لازوال مسرتیں عطا کر دیں۔ مجھے اپنے گراں بہا خلوص سے سرشار کر دیا۔ میرے پاس اب وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے میں اپنی اس وقت کی بے پایاں مسرت و انبساط کا اظہار کر سکوں۔

جبکہ مجھے پتہ چلا کہ میرا معمولی سا خط خالد صاحب نے پڑھا تھا (میری کم علمی اور جہالت پر یقیناً مسکرائے بھی ہوں گے)

اور پھر میری زندگی کی اولین آرزو پوری ہوئی تھی۔ کہ ان کا بھیجا ہوا گراں قدر و بلا قیمت تحفہ فارقلیط مجھے ملا تھا۔ اللہ جو سب سے سچا گواہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مجھے یقین ہی نہ آسکا تھا۔ اپنا پہلا نعتیہ کلام فارقلیط سچ مچ خالد صاحب ہی نے مجھے بھیجا تھا۔ پہلا خط جسے پڑھ کر مجھے اپنی خوش نصیبی پر آپ رشک آنے لگا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ لگن سچی اور طلب صادق ہو۔ تو مراد پوری ہو جاتی ہے۔ خالد صاحب کے خط کا جواب دیتے ہوئے میں کتنا گھبرائی تھی۔ پریشان ہوئی تھی۔ کتنے خط لکھ لکھ کے پھاڑے تھے۔ ایک بھی موزوں مناسب نہ لگا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا میں اس طرز و نہج کا خط لکھ بھی سکتی ہوں؟ لہٰذا ایک خط ایسا بھی سہی خدا کی قسم! اس خدائے علم و رسولِ فن کے سامنے اپنی کم علمی اور جہالت کا اعتراف کرنا میری سب سے بڑی مسرت ہے۔ میں نے بڑے عظیم خود بڑے بڑے شاعر بھی دیکھے ہیں۔ پڑھے لکھے پروفیسروں سے بھی سابقہ پڑا ہے۔ بے گنتی ادیبوں کی کاوشیں نظر سے گزری ہیں۔ عربی اور فارسی کے شعراء بھی میرے لیے گمنام نہیں رہے۔ انگریزی ادیب و شاعر بھی نئے نہیں۔ جتنی میری استطاعت و استعداد تھی اس حد تک میں نے تھوڑا بہت کسی نہ کسی کو سمجھا بھی ہے۔ لیکن ان کی تحریریں مجھے حتمی طور پر مطمئن نہ کر سکیں۔ کوئی اچھی چیز انسان کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔ دل کے مطمئن نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ جویائے حق کو ایک مستقل خدا کی تلاش ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو خدا بہت بعد میں ملا۔ حضرت سلمان فارسی کو دس آقاؤں کی غلامی کے بعد اپنا آقاؐ ملا۔

اور مجھے بھی اِدھر اُدھر کے پھیکے، بے جان، مُردہ، کھوکھلے، غیر ذی رُوح بتوں کی جاہلانہ ستائش کے بعد اپنا زندہ و پائندہ معبود مل گیا۔ وہ بہت بڑا ہے۔ بہت عظیم ہے۔ نہایت علم و فن والا ہے۔

وہ بے حد و بے نہایت و بے انتہا ہے۔

مگر میرا محبوب ہے۔ میرا آدرش ہے۔ میرا آئیڈیل ہے۔ میری رُوح ہے۔ میری زندگی ہے۔ میں شروع سے اس عظیم و برتر شاعر کی مدحت و ثنا کرتی رہی ہوں۔ اور جب تک میرے سینے میں سانسیں، قلم میں طاقت باقی ہے۔ کرتی رہوں گی۔ اس افسوس کے ساتھ کہ الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے۔ جذبے مربوط و مسلسل ہو کر کاغذ پر منتقل نہیں ہو سکتے۔ محسوسات اظہار کی گرفت میں نہیں آتے۔ اور میں یہی سوچتی ہوں کہ وہ بہت بڑا، بہت بڑا، بہت بڑا انسان جس نے مجھے اپنی توجہ اور محبت دی ہے۔

میں نے اسے کیا دیا؟

عفت موہانی

حیاتِ جاوداں

پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن
حشر کے بعد ان گنت مخلوق اپنے اپنے اعمال کے مطابق جہاں تہاں ہو چکی ہے۔
پروردگارِ عالم نے انصاف کر دیا۔ اب وہ بھی کرسی انصاف سے اٹھ کر عرش پر آرام کرنے جانے والا ہے۔
ایک طویل ترین دن کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دینا کچھ آسان کام ؟؟
دفعتاً سناٹے میں آہ و فغاں کی آوازیں گونجیں۔ فرشتے ایک ہستی کو پروردگار کے سامنے لائے۔
خداوندِ ارض و سما کو تعجب ہو گیا۔ ہائیں! یہ کون ہے؟ کہاں چھپی بیٹھی تھی؟ کیا اس کا حشر نشر نہیں ہوا؟
"پروردگار"! فرشتے اپنی غفلت پر شرمائے۔ "ان گنت مخلوق آج اکٹھا تھی۔ نجانے کس کے پیچھے چھپی رہی تھی۔ اب میدان صاف ہوا ہے۔ تو دکھائی دی ہے!"
"اعمال نامہ کہاں ہے اس کا؟"
"پروردگار! یہ بڑی ہوشیار لگتی ہے۔ کروڑوں برس پہلے جب دنیا سے اعمال کا پشتارہ لے کر آئی تھی۔
تبھی آتے کے ساتھ ہی سارے کا سارا تیرے آتش دان، مطلب یہ کہ جہنم میں پھینک دیا تھا۔ بے اعمال رہ گئی ہے۔ اسی لیے تجھ سے صورت چھپاتی پھر رہی ہے؟"
"صورت سے پہچانی نہیں جا رہی!"
بار الٰہا! جب یہ یہاں آئی تھی۔ تب سوکھی چمڑی ایسی چھوارہ ہو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے آسمانوں کی صاف شفاف تازہ ہوا کھاتی رہی ہے نا! اسی لیے ذرا بنی ٹھنی دکھائی دے رہی ہے!"
"مکار اعظم لگتی ہے۔ اٹھا کے پھینک دو اسے بھی جہنم میں!"
"یا مالک"۔ ہاتھ تو لگانے ہی نہیں دیتی۔ وہ شور و غل مچاتی ہے۔ کہ تیری پناہ! کہتی ہے تم سب کے سب نامحرم ہو۔ خبردار مجھے اگر انگلی بھی چھوائی تو خداوند قہار و جبار سے شکایت کر کے آگ کے اتنے کوڑے لگوا دوں گی۔ کہ چھ مہینے بیہوش پڑے رہو گے! بڑی آفت کی پرکالہ لگتی ہے۔ مالک الملک! بتا اس کا کیا کریں؟
خیر تو ایک ہماری مخلوق کا کیا؟ ہم رحیم و کریم ہیں۔ اسے بخش دیتے ہیں۔ جنت میں پھینک دو اسے!"
"پروردگار! جنت ہاؤز فل جا رہی ہے۔ کونے کھدرے میں بھی جگہ نہیں۔ اور پھر یہ تیری بندی جنت میں بھی جانا نہیں چاہتی!"

"پھر اس کی مرضی کیا ہے؟"

"اے رب کریم! یہ بڑی گستاخ ہے۔ منہ پھٹ ہے۔ ضدی سی لگتی ہے۔ اس کا مطالبہ عجیب وغریب ہے۔ ہم اسے تیرے سامنے وہراتے کانپتے ہیں۔ آپ اس سے پوچھ لیجئے!"

رب العالمین کے سامنے عرض حال!

"اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا۔ تیری رحمتوں اور نعمتوں کا شمار نہیں۔ مگر میری جانب سے مجھے صرف ایک دکھی دل ملا۔ یہ تیری مصلحت تھی میرے مالک! تیرا کوئی کام اچھائی سے خالی نہیں ہوتا۔ تو نے مجھے اپنے خزانۂ خاص سے صرف اور صرف "محبت" کی نعمت عطا کی۔ جو تیری اس ناچیز بندی نے ایک خاص آدمی پر صرف کر دی جو ہمیشہ تیرے محبوب کے گیت گاتا۔ جن کا رُواں رُواں تیرے پیارے نبیؐ کی محبت میں ڈوبا رہا۔ اور آج جسے تو نے فردوس بریں کے سب سے اعلیٰ اور برتر منور و تاباں محل میں جگہ دی ہے جو اب بھی تیرے محبوب کی محبت کے حسن و جمال سے جگمگا رہا ہے۔ تو اے رب ارض و سما! اپنی اس بے سروسامان بندی کو بھی اس محل میں تھوڑی سی جگہ عطا کر دے جن کے مقابلہ میں تیری جنت مجھے بھاتی نہیں۔ اے رب کریم! بس اتنی سی عرض ہے میری!"

ہاں! وہ ہمارا خاص بندہ جسے حسین و جمیل چہرہ دے کر ہم نے اپنے حبیبؐ کی محبت میں بسا ہوا دل عطا کیا۔ جسے "عبدعزیز" نام بخشا۔ اور اس کے درجات و مراتب بلند کیے۔ جو ہمارا حبیبؐ و محبوبؐ ہے۔ وہی اس کا بھی حبیبؐ ہے۔ جا! تجھے اس محل کے ایک گوشے میں جگہ دی جاتی ہے۔ کہ محمدؐ کے چاہنے والے کو چاہنا اور دیکھتے رہنا بھی ایک عبادت ہے۔"

عفت سوہانی

ایک کہانی چھوٹی سی

جب کارگہِ دہر سے میں کوچ کروں گی
تب نام بھی میرا کسی محفل میں نہ ہوگا

اور یہ کہانی کچلنے کا قصہ کڑھن کی کتھا ہے

بہت دن گزرے مگر بات ابھی بھی نئی ہے۔ کسی جگہ ایک خاموش گم سُم، زود رنج، حساس اور جذباتی لڑکی رہتی تھی۔ خدا نے نجانے اس کا دماغ کیسا بنایا تھا۔ کہ اسے دنیا سے، دنیا والوں سے اور دنیا کی کسی دلچسپی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح احساس تھا

آشنا کس کو کہیں نا آشنا کس کو کہیں
لوگ ملتے ہیں مگر مل کر بھی ملتے ہیں کہاں

اس کا چھوٹا سا پُر سکوت مسکان، سب گھر سے الگ تھلگ کمرہ

تھا اس کے لیے قلعۂ محکم

تنہائی اس کی ساتھی، زبانِ حال سے باتیں کرتی ہوئی، کتابیں اس کی سہیلیاں تھیں۔ لوگ اسے بد دماغ، مغرور، کم آمیز، خود سر اور نجانے کیا کیا کیا کرتے تھے۔ اسے افسوس بہت ہوتا تھا لیکن

بخوفِ حرف گیرانِ ستمگر
نہ لاؤں بات دل کی میں زباں پر

یہی اس کا شعار تھا۔ اپنے عجیب سے دل کی بات کس سے کہتی۔ دل مسلسل مضطرب کیوں رہتا تھا۔ دماغ میں کیسے کیسے طوفان بپھرا کرتے تھے۔

اک ازلی التہاب اک ابدی اضطراب
مبداء فیاض سے قسمتِ آزادگان

مگر اس بے چینی میں لذت کتنی تھی۔ اس اضطراب میں سکون کتنا تھا۔ اس بے تابی اور بے قراری میں کتنی مسرتیں پوشیدہ تھیں۔ کیا کوئی ظاہر بین اس ہستی کے دل کے پاتال میں جھانک سکتا۔ نہیں — کیونکہ وہ جانتی تھی

غم دل کو بے نقاب نہ کر
نہیں درد مند اہلِ جہان

اپنی عمر میں اس نے بہترے شاعروں کا کلام کھنگال ڈالا۔ بے شمار ادیبوں کی کاوشوں کا مطالعہ کر لیا۔ لیکن ذہنی ناآسودگی، قلبی بے کلی اور روحانی تڑپ بڑھتی ہی رہی۔ اسے یہی انداز ہوتا تھا۔ یہ سارے قلم کار بزعم خود ادب و شعر کے دعوے دار ہیں۔ وہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ ان کا علم سطحی ہے۔ ان کی معلومات نامکمل ہوتی ہیں۔ وہ خالی الفاظ کے انبار لگاتے ہیں۔ جن میں تہہ، انادیت، معنی آفرینی، کشش، دلچسپی، حسن و نزہت اور دلکشی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا وہ سب قلم والے

ع پانی پہ اُترتے نہیں منڈلاتے ہیں

لیکن اس درک و اعتراف کے باوصف کتاب اس کے ہاتھ سے کبھی الگ نہ ہوئی۔ قلم اس کا ہمیشہ ساتھی رہا۔ وہ خود بھی ادبیت، انشاء نویسی اور شعر و شاعری کی شیدا تھی مگر

ہمیشہ نہ پورا ہو منشائے خاطر

اور یہی بے کلی، کسی مکمل ادیب، کسی واقعی شاعر کی تلاش اس کے متعدد کتابوں کے اوراق اُلٹنے، رسالوں کو چھانٹنے۔ پھٹکنے۔ کی وجہ بن جاتی تھی۔ لیکن اسے کیا ملا؟ ناامیدی، پیاس، اضطراب، بے قراری ——————

لوگوں کو تعجب تھا۔ اس کے پاس تو سب کچھ ہے۔ کسی چیز سے قدرت نے اسے محروم نہیں رکھا ہے۔ تو پھر

ع نجانے کس الجھن میں یہ مبتلا ہے

وہ کسی کو کیا بتاتی۔ اپنے احساسات و جذبات کا تجزیہ کرنا خود اس سے بھی ممکن نہ تھا۔

کتاب زندگی کے سیاہ و سفید ورق ایک کے بعد ایک الٹتے گئے۔ بے کیف۔ بے فائدہ۔ بے مقصد اور بے جان دمردہ شب و روز

وہ اکثر سوچتی تھی تخلیق عالم و آدم کا منشا کیا ہے۔ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ خدا تماشائی اور انسان تماشا

اس گورکھ دھندے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا خدا اکیلا گھبرا رہا تھا؟ شاید! خدا نے بہت سی چیزیں کارآمد بھی پیدا کی ہیں۔ مگر وہ خود —— اسے احساس تھا۔

مری رائیگاں زندگی کا یہاں
نہ مقصد نہ مصرف نہ منشا کوئی

اس نے اپنی بے کیف پھیکی زندگی سے سمجھوتہ کرنا شروع کیا۔ اپنا مشن مگر جاری رکھا۔ حضرت ابراہیم کی سی جستجو تھی۔ شاید۔ "ربّ الارباب" مل جائے۔ فرش زمین پر رینگتے ہوئے حشرات الارض میں گرد و باد میں چکراتے ہوئے خس و خاشاک میں، منمناتے گنگناتے ہوئے بونوں اور بالشتیوں میں وہ آخر کسے تلاش کر رہی تھی۔

"ربّ الارباب" فرش زمین پر نہیں مل سکتا۔ اس کی منزل آسمان ہے۔ وہ شمس و قمر کی روشنی میں مدغم ہے۔ اس کا نور ستاروں میں ہے۔ وہ طائر بلند پرواز بہت اُونچی اڑانوں میں ہے۔

اور پھر دفعتہً مطلع شاعری منوّر و تاباں دکھائی دینے لگا جیسے

ضیائے صبح درخشاں بکھیر دے کوئی

وہ جویائے ربّ شاعری۔ فرط حیرت و وفور مسرت سے دیوانی سی ہو گئی۔ حضور شعر کے آگے سربسجود ہونے کو تمنّا نے اسے بے چین کر دیا۔

ع   نہ دن کو چین میسر نہ رات کو راحت

ایک خلش ایک آرزو اس کے دل میں کروٹیں بدلنے لگی۔ کیسے اور کیونکر اس شہنشاہ ادب و پروردگارِ شعر کی بارگاہ میں رسائی ہو سکے گی۔

بڑے دنوں تک وہ اس نئی مسحور کُن آواز کے سحر میں کھوئی رہی۔ اور ماہیِ بے آب کی طرح اس اقلیمِ قلم کے تاجدار کی دید و شناسائی کی آرزو میں کلپتی رہی۔

ع   یہ گلو گیر خموشی یہ عذابِ جاوید

گویا کہ اس مجبور کے سینے میں سانسوں کی آمد و شد کو گھونٹے دیتا تھا۔ عجیب عجیب احساسات کے لاوے اس کے دل میں مچلتے رہے مگر

دشوار تھا اسرارِ محبت کا بیاں

کوئی ہمدم و ہمراز نصیب نہ تھا۔ آدمی اپنی محبت کا آپ امین و رازداں ہوتا ہے۔ اور پھر اسے تمنا یہ تھی اپنے پروردگارِ حسن و محبت کی پرستش وہ اکیلی کرے۔ کسی اور کی شرکت بھلا اسے کیا گوارا تھی؟ اس نے اس ہستیِ بلند و برتر کو صرف اور صرف اپنا مان رکھا تھا۔ اور بس

دل اس سے طلب گار جام دلا تھا

روز و شب کی بے کلی، اپنے آپ کلپنے نے زندگی ایک مسلسل سزا بنا رکھی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ اپنے محبوب و پسندیدہ۔ حسین و خوبرو، نیک دل و نیک نفس شاعر کے حضور اپنی عقیدتِ فراواں کا اپنے قلم سے اظہار کرے۔

زمانہ ہمیشہ سے بڑا سخت گیر رہا ہے۔ بزرگوں کے اپنے اقدار و خیالات بھی نئی نسل کے محسوسات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ اور اس پرستار کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے چودھویں کے چاند کی دیوان چکور ——— چاند تک پہنچنے کے لیے بے تاب و بے قرار ———

اے مرے اوّلین و آخری محبوب شاعر!

دے مجھے رخصتِ گزارشِ شوق
کھلے تیرے حضور میری زُباں

محبت سچی آرزو خالص اور تمنا بے لوث ہو تو دل سے دل تک پہنچنے کی راہ نکل ہی آتی ہے۔

وہ دن بے موسم عید کا تھا۔ جب تاجدارِ محبت نے دریوزہ گرِ اُلفت کے خالی کشکول میں اپنی توجہ و التفات کے سنہرے سکّے ڈالے۔ اور متلاشیِ ربّ الارباب کو اس کے چاہنے والے پروردگار نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔

پھر اس درماندہ ہستی کو پتہ چلا۔ اس کی بے مقصد و ناکام زندگی کا بھی ایک مقصد تھا۔ اب وہ بے کار و بے سود نہ تھی اپنی نظروں میں بہت اہم تھی۔

وہ دیوتا وہ بادشاہ اب اس کا تھا۔ دل کے ساتھ، ذہن کے ساتھ اپنے سارے خلوص اور اپنی تمام مراعات کے ساتھ اپنی کنیز کا۔

اس نے پل بھر کے لیے بھی نہیں سوچا کہ

ع میں کوہِ فلک بوس ہوں وہ کاہ سبکبار

اس کا دل وسیع ترین تھا۔
اس کا ظرف بلند تھا۔
اس کا ذہن پیغمبرانہ تھا۔
سچ تو یہ ہے کہ اس ہستی بلند و برتر کی کماحقہٗ مدح و ثنا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
اور وہ لڑکی جو عمر کی منزلیں طے کرتی۔ شدائد حیات سہتی، اپنوں کی اَبدی جدائی کے داغ برداشت کرتی۔
اب ایک تنہا منزل پر آکھڑی تھی۔ تب بھی اس کا جذبۂ فراواں، عقیدت و ارادت بے پایاں جُوں کی تُوں تھی۔

محبت ایک چار حرفی لفظ ہے

لیکن یہ کیا چیز ہے؟ وہ زبانِ حال سے گاتی تھی۔

لمحہ لمحہ نفس نفس مجھ کو
تجھ سے کیا بے کراں محبت ہے

اور یہ سمجھتی تھی۔ کہ ایک یاد، ایک خیال، ایک جذبے کو یُوں ذہن و دل میں سمو لینا کہ ہمہ تن اسی کے ہو جانا ہی محبت ہے۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اکیلے میں، محفل میں، یہاں اور وہاں ہر جگہ، ہر وقت، ہر پل، اور ہمیشہ جو ہستی ساتھ ہے۔ وہ محبّت ہے۔
پھر بھی چاہنے والی اتنی کم مایہ، اتنی درماندہ، اتنی بے بضاعت تھی۔ کہ اپنے دلی محسوسات کو پوری طرح واضح کرنے سے قاصر تھی۔ مگر کتنی خوشی اور اطمینان کی بات تھی

کائنات اَدب و شعر کا پروردگار
اس کے پاکیزہ تصوّر کا محور
اس کے سازِ ہستی کا منشاء
اس کے دل کی دھڑکن
اس کا اور صرف اس کا اپنا شاعر

اس کے محسوسات سے بے خبر نہ تھا۔ اور اس ادراک و عرفان کے بعد زمین و آسمان، دولتِ دنیا و دیں کی اسے پرواہ نہ رہ گئی۔ اب وہی

نُور کا مینار ہے اُمّید کا تارا

غلمان صورت پیمبر سیرت

دنیا کی کسی ڈکشنری میں وہ الفاظ نہیں۔ جن سے اس کی تعریف ہو سکے۔
کسی کو کیا خبر کہ بیس سال کی ایک لڑکی پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی ذہنی طور پر اتنی ہی ناسمجھ لڑکی رہی۔ کسے معلوم کہ اسے ایک شاعر سے دلی محبت ہے۔ خاموش، گونگی، پاتال کی سی گہری محبت!
دنیا ایک سرائے ہے۔ وہ اپنا کرایہ اپنی اُجرت روزمرّہ کے فرائض کی صورت میں لے ہی لیتی ہے۔ مگر وہ ایک

گہری آہ بھر کر وہ جو کہیں گم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہیں پھانس چبھی ہو۔ اور اچانک وہ ٹیس بن کر کھٹک گئی ہے۔ پھر یہ لہر دُور ہوئی اور دنیا نے اپنا تاوان لینا شروع کر دیا۔

انسان کسی کنوئیں سے پچاسوں ڈول پانی نکالتا ہے۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ کنوئیں کی تہ میں اُتر کے بھی دیکھے۔ وہاں کیا کیا ہے۔ سنگریزے ہیں کہ موتی ؟ انسان کا دل، انسان کا ظاہر بھی تو ایسا ہے لوگوں کو فریب دینے والا۔ پیدائش سے لے کر موت تک۔ کوئی انجانا، پُر اسرار، عجیب سا نقاب انسان کے چہرے پر۔ اس کے کردار پر، خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے پڑا رہتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا اس کے نقاب کے پیچھے کیا ہے۔ آدمی کی ہستی کیا ہے۔ اس کی خوش طبعی، کوئی پردہ، کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔ غموں، دکھوں، زخموں اور آنسوؤں کو پوشیدہ رکھنے کا گہرا پردہ۔ انسان جسے خود اُٹھا کر اس کے پیچھے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

اور بس، ایسا ہی ظاہر تھا، خوش طبع، بے فکری اس جویائے محبت ہستی کا۔

کیا یہ ممکن ہے۔ کہ کوئی کمزور دل عورت اتنی مضبوطی سے اپنے احساسات و جذبات پر قابو پائے رکھے ؟ یہ کارنامہ صرف اور صرف عورت ہی کا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنا کوئی شدید جذبہ اپنے کمزور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ رکھ سکتی ہے۔

کیا کوئی اس کے ساتھ اتنی رعایت نہ کرتا۔ کہ اسے اس کی محبت کے ساتھ جینے دینا۔ جینے کے بھی بہانے ہوتے ہیں۔ کسی اپنے کے بے پیار محبت کے بغیر یہ زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ دل پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ میرے مرکز و محورِ حیات! دل جو اپنا ہے۔ مگر جب وہ کسی کا ہو جاتا ہے تو اس کی دشمنی پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ جس کے سینے میں دھڑکتا ہے۔

بے وفائی ہمیشہ سے دل کا شعار ہے۔

کیا سارا سال بعد کوئی یہ اعتراف کرے گا۔ کتنی صابر، ضابط اور مظلوم ہستی تھی۔

ساری عمر صورت شمع جلتی پگھلتی رہی۔
کسی جلن یا تڑپ پر اُف نہ کی۔
محبت آہیں بھرواتی ہے
محبت آنسوؤں کا خراج چاہتی ہے
محبت رت جگے مانگتی ہے
محبت چین قرار چھین لیتی ہے
محبت بہت اچھی ہے
محبت بہت بُری چیز ہے
مگر میری محبت لازوال و لافانی ہے
اور میرے محبوب کی زندگی مجھے بھی زندہ رکھے ہوئے ہے

اے برزخِ غیب و حضور!
عفت کا قلب ناصبور
تیری محبت میں ہے چور!

بیک دماغ

کوئی سیّاح کبھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دورانِ سیاحت میں اس نے مظاہر و عجائباتِ قدرت کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ نہ کسی غوّاص کا یہ کہنا درست مانا جا سکتا ہے کہ اس نے بحرِ بیکراں کی وسعتیں اور گہرائیاں ناپ لی ہیں۔ ہر کاملِ فن اپنے کمالِ فن میں کسی حد تک ادھورا اور ناقص ہے۔ یہی صورت حال خالد صاحب کے علم و فضل اور ان کے ہزاروں شاگردوں کی بھی ہے۔ لکھنے والوں نے تو اپنی دانست میں اپنی ساری ذہنی توانائیاں صرف کی ہیں۔ کوشش ضرور کی ہے کہ عمدہ الفاظ، خوب صورت پیرایۂ اظہار اور دلی عقیدت کا مظاہرہ کیا جائے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ثنا گرانِ خالد اپنی سعی و کاوش میں کما حقّہ کامیاب بھی رہے ہیں؟ خالد صاحب کے لیے احترام چاہیئے، تعریف چاہیئے اور پرستش چاہیئے۔ خالد صاحب کو خُدا نے جو غیر معمولی صفات، بے حد و حساب علم و فضل، سمجھ میں نہ آنے والی تخلیقی صلاحیت، اور مسحور کن عادات عطا کی ہیں۔ ان چیزوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ میں بھی تعریف و ستائش ممکن نہیں ہے۔ ہزاروں لکھنے والوں نے خالد صاحب کی مدح و ثنا کی ہے مگر میری دانست بھی سارے ضخیم و عظیم نمبر نامکمل اور تشنہ ہیں۔ کوئی بات لکھنے سے پھر بھی رہ جاتی ہے اور وہ بات کون سی ہے۔ یہ تو وہی عالم جان سکتا ہے جو خالد صاحب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ ایسا عالم فی زمانہ کوئی ہے نہیں!۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں کوئی بڑے سے بڑا شاعر خالد صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مستقبل میں بھی خالد صاحب کی سی جامع کمالات شخصیت کی تخلیق ناممکن ہے۔ فلک کی برسوں گردش کے بعد خاک کے پردوں سے ایک انسان نکلتا ہے اور پھر قدرت وہ سانچہ توڑ دیتی ہے۔ ایسا انسان جیسے خالد صاحب ہیں۔ صدیوں بعد صرف ایک پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی رہتا ہے۔

سُورج کو چراغ دکھانا ممکن ہے۔ تیز دھوپ میں ننھّے سے دیے کی روشنی بہر حال معدوم و موہوم سی اپنی انفرادیت اور زندگی قائم رکھے گی۔ لیکن خالد صاحب کی تخلیقی کاوشوں پر تبصرہ کرنا ناممکن ہے۔ اُن کی معجز نما تصانیف کسی تبصرہ، تعریف اور تنقید سے ماورا ہیں۔ وہ آپ اپنی مثال ہیں۔

ایک معمار علم و فن جس نے
کیے تعمیر فکر کے اہرام

اور شاید کسی کے پاس نقد و تبصرہ کا وہ فیتہ نہیں جو ان اہرام کی بلندی ناپ سکے!

وہ تو عالی ظرفی، صبر و ضبط اور طاقت برداشت کا ایک کوہ گراں ہیں۔ جنھوں نے معترضین کی زبان درازیاں بھی خاموشی سے برداشت کر لیں اور مدّاحین کی مدح و ستائش پر بھی غرور و تکبّر سے کوسوں دُور رہے۔ صانعِ کامل کی اس صنعتِ کامل کی تعریف جتنی بھی کی جائے۔ جہاں تک کی جائے کم ہے بہت کم ہے۔!

خالد صاحب سے لیے ہوئے متعدّد انٹرویو بھی نظر سے گزرے۔ ان میں بھی سوال و جواب کا عجیب فرق دکھائی دیا۔ انٹرویو

کے سوالات خالد صاحب کی قد آور بارعب دبا دقار شخصیت کے مقابلہ میں بڑے پست اور معمولی ہوتے ہیں۔ اور جوابات اتنے پُرمغز، عالمانہ، رفیع الشان جو انٹرویو باز حضرت کے معیار سے بہت زیادہ بلند۔ کبھی کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عالمانہ بلیغ اور عمیق جواب دوسرے فریق کی سمجھ ہی میں نہیں آیا ہے۔ اکثر کھلے ہوئے مُنہ اور حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اسی افسوس ناک لاعلمی کی غماز ہوتی ہے۔

اسی انٹرویو کے ضمن میں پتہ چلا کہ خالد صاحب کے مغلق، مشکل، اور نامانوس اشعار کسی کے ذہن میں نہیں محفوظ رہتے۔! کیسی عجیب بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی ذہین و فطین و شوقین آدمی چاہے تو مثنوی مولانائے روم کے بیشتر اشعار یاد کر سکتا ہے۔ حافظ کے کلام کو ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ سعدی کی گلستان کی حکایات اُسے فر فر یاد ہو جاتی ہے۔ وہ اگر چاہے تو غالب کا دیوان، اقبال کی ساری تصانیف، حالی کی مسدس، اور جس شاعر کا جو کلام ہو سب ازبر کر لے۔ یہ سب چیزیں ذہن میں امٹ نقش چھوڑ جانے والی ہیں۔ کیونکہ بہت آسان بہت سہل بہت دل نشین اور پُرکشش ہیں۔ اور پھر یاد رکھنے والے صاحب ذوق کا ذہن بھی ایسا ویسا نہیں۔ مشکل بس خالد صاحب کے نامانوس، ادق، دشوار، اور سنگلاخ شعروں ہی کے ساتھ پیش آتی ہے وہ کسی صورت سے ذہن میں سماتے ہی نہیں۔ کم سے کم آدھا مصرعہ ہی یاد رہ جائے۔ سو یہ بھی ممکن نہیں۔ یاد کرنے والوں نے تو ایک کمڑا اور کمھی، گائے اور بکری، دال کی فریاد، اور در صفت انبہ تک ازبر کر رکھی ہیں۔ کاش خالد صاحب کالا تلیط، منجستا، بحر صریر، سراب ساحل، گل نغمہ وغیرہ وغیرہ پر خامہ فرسائی کرنے کی بجائے لب و رخسار کی مبالغہ آمیز تعریف، شمع و پروانے کے قصّے، زلف گیرہ کے شکنجے، ہجر و وصال کی واہیات داستانیں اور گل و بلبل کی حکایتیں لکھتے تو عجب نہیں کہ پوری پوری غزلیں شائقین کو یاد رہ جاتیں۔ کتنی عبرت کی بات ہے!۔

خالد صاحب نئی شاعری کے پیغمبر ہیں۔ انھوں نے نیا کعبہ بنایا۔ پُرانی شاعری کے بُت زمین پر آرہے۔ شاعری کو ایک سماوی آواز نصیب ہوئی، نئی جہت ملی۔ نئی روشنی ملی۔ انھوں نے نقارۂ ادب و شعر پر اتنی زور سے ضرب لگائی ہے کہ اس کی گھن گرج سے ایوانِ شاعری گونج اٹھا۔ اور مسلسل گونج رہا ہے۔

خالد اک مرد یگانہ ہے رضیع حکمت
جس کا ثانی ہے نہ انبار و شریک و ہمتا
اس کی تعریف میں سب متفق اللفظ ہوئے
اس کے سر پر ہے خداوند خُدا کا سایہ
اس کے اشعار کو تم مخزنِ اسرار کہو
ہم نے پایا اسے ہر صنف سخن میں یکتا

مجھ بے بضاعت، بے نوا، بے قیمت سی بے نام و گمنام ہستی کو بھی خالد صاحب سے وابستگی کا شرف حاصل ہے۔ حالانکہ وہ کہاں اور میں کہاں۔!

میں کاہ سبکسار ہوں۔ وہ کوہ فلک بوس

ایک طویل عرصے سے خالد صاحب کی معطّر معنبر تصانیف نے مجھے دیگر کتب کے مطالعہ سے یکسر بے نیاز کر دیا ہے۔ میں نے ان کے کلام اور بیش بہا خطوط سے بہت کچھ یاد کیا ہے۔ مجھے تعجّب ہوتا ہے ان حضرات پر جو یہ کہتے ہیں کہ "خالد صاحب کے اشعار ذہن میں محفوظ نہیں رہتے! اور ان کے اشعار کی ملک کے خواص و عوام کے ذہنوں تک رسائی کیوں نہیں ہوتی ؟"

ہم لوگ فلم، ٹی۔ وی، ریڈیو اور اسی قسم کی دوسری نحوستوں کے صدقے گانے بجانے کی حد تک بڑے کہنہ مشق اور پختہ کار ہو چکے ہیں۔ ہمارے علماء صلحاء کے ریڈیو بھی اندھیرے اجالے نورانی گلے والے فنکاروں کے روح پرور اور سامعہ نواز تانوں سے روحانیت کے جوہر کشید کیے بغیر چین نہیں لیتے۔ عالم فاضل، زاہد عابد، اور کون ہے جو ارادتاً نہ سہی۔ بہ درجۂ مجبوری ہی سہی۔ ان کی واہیات نغمہ ریزی سے بچ رہتا ہو اور بڑے عمدہ و موثّر گانے مثلاً ؎

آواز دے کہاں دُنیا مری جواں ہے

یا پھر

لڑکی غصّہ ہو تو حسین ہو جاتی ہے

ٹرین چھوٹتی ہے تو ایک دو تین ہو جاتی ہے

وغیرہ کو اتفاقاً دماغ کے کسی گوشے میں رینگتا نہ محسوس کرتا ہو۔ اور غالباً تنہائی میں ان مہمل مصرعوں کی بازگشت بھی دماغ کی وسعتوں میں خواہ مخواہ اور بے ارادہ گونجتی ہے۔ دماغ میں اتنی صلاحیت اور اثر پذیری بہر حال ہے کہ اس قسم کے لغو مہمل اور فضول شعر قبول کر سکے۔ (بے ارادہ۔ غیر محسوس طور پر) اور یہ بھی انسانی ذہن کی خوبی ہے کہ نہ چاہے تو کوئی اچھی بات کوئی اچھا شعر کوئی عمدہ قول یاد نہ رکھ سکے۔ اور ذہن انسانی اچھی چیزوں کو محفوظ رکھنے سے کیوں گریز کرتا ہے۔ اس کی کوئی معقول توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی تردید و نفی کرنے کا طریقہ ہے اور ضد ہے گویا اپنی پسند یا ناپسند، اپنی مرضی اپنا ارادہ، خود اعتمادی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ دوسروں کی تنقید یا تعریف پر آنکھ بند کر کے سر ہلا دینا کم اعتمادی اور کمزور قوّت فیصلہ کی دلیل تو بے شک ہے۔ لیکن قابل فخر و مباہات عادت ہرگز نہیں۔

یہ نامناسب بحث، زیادتی، اور زبردستی، بس دلشکنی کی ایک مثال ہے۔ دُنیا میں جتنے بھی پیغمبر مبعوث ہوئے۔ کسی اُمّت نے خندہ پیشانی سے انہیں قبول نہیں کیا۔ تمسخر و استہزا کے پتھر کس پر نہیں پھینکے گئے۔ کسی پیغمبر کی مثال نہیں ملتی جسے اپنی تعلیم و تبلیغ کی ابتدا میں گوناگوں آفات و مصائب، تکالیف اور نافرمانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ یہی حال ہر بڑے عالم و مصلح کا ہوا ہے۔ کسی نئی آواز کا خیر مقدم عالی ظرفی اور خندہ پیشانی سے نہیں ہوا۔ ان سب کی دل آزاری میں اپنی۔ ذاتی موت کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ لیکن یہ سب عبوری دور کی باتیں ہوتی ہیں۔ حقیقت اپنی اہمیّت بہر حال منوا ہی لیتی ہے۔ آدمی اپنی زیادتی محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن زیادتی پر نادم ہونا نہ ہونا یا اپنی رائے پر ڈٹے رہنا اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

شاعر و ادیب بھی اسی صف میں آتے ہیں۔ شاعر ادیب اپنے ساتھ اپنے جرّاح یعنی ناقدین کو ساتھ لے کر دنیائے ادب میں قدم رکھتے ہیں۔ کسی ادبی کاوش پر مخلصانہ تنقید اس شئے کے نکھارنے اور سنوارنے اور مزید ثمر آور ہونے کا باعث بنتی ہے۔ مگر وہ تنقید جو ذاتی پسند ناپسند یا جانبدارانہ اصول پر محض دل شکنی یا حوصلہ فرسائی کے مدِّ نظر ہو جائے وہ تنقید نہیں۔ دشمنی ہو جاتی ہے۔!

کیا ہمارے شاعر اور ادیب اس قسم کی جارحانہ اور جانبدارانہ تنقید سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔؟

میرا یہ مضمون "بیک دماغ" بیک نظر کے مقابلہ میں) شاید خود بھی اسی قسم کی شدید تنقید کا نشانہ بن جائے اور بہت سے

قلم اس کی تردید و تنقیص لکھنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ لیکن مجھے بس یہی کہنا ہے کہ خالد صاحب میرے شاعر ہیں۔ میرے لیے بیغمبرانہ صفات سے متصف وہ ایک مکمل انسان ہیں۔ جن سے وابستگی کا فخر مجھے مسرور و مطمئن رکھتا ہے خالد صاحب کی بہت ادنیٰ ستائش گر ہوں۔ لیکن اپنی جہالت اور کم علمی کے باعث مطمئن نہیں کہ مجھ سے اُن کی پوری پوری تعریف ہو بھی سکی ہے کہ میں بھی اوروں کی طرح ناکام ہوں! خالد صاحب کے نعتیہ اور غیر نعتیہ کلام نے مجھ پر اس طرح اثر کیا ہے کہ مجھے مسحور کر دیا ہے۔ یہ مضمون "بیک دماغ" اسی اعتراف کا مظہر ہے کہ ان کے وہ اشعار جو ذہنوں میں محفوظ نہیں رہتے۔ کس طرح میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ یہ تصور بالکل غلط ہے کہ ان کے اشعار سبھی مشکل ہوتے ہیں۔ بعض اتنے حسین، دلکش، پُرکشش اور موثر ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے یوں ذہن میں جم جاتے ہیں جیسے کچی مٹی میں پانی جذب ہو جائے، جیسے سونے میں نگینہ جڑ جائے۔ یہ اشعار جو میں نے پیش کیے۔ وہ مجھے ازبر ہیں اور بھی بہت سے مصرعے ہیں۔ جو میری یادداشت میں تازہ ہیں!۔ اور یہ سب بیک دماغ یاد رہ گئے ہیں۔ کتاب سامنے رکھ کر انہیں رٹنا نہیں پڑا۔

خالد صاحب اچھے ہیں بہت اچھے۔ اُونچے ہیں بہت اُونچے۔ بلند ہیں بہت بلند۔
خالد جو نظر آتا ہے کچھ اس سے سوا ہے۔
میری دلی دعا ہے۔

نام تاباں رہے ترا جب تک
آسماں کے چراغ ہیں روشن

اس کے بعد کوئی سو شعر لکھے ہیں

عفت موہانی

تعبیرِ طلب

بیس سال کی طویل مدت اس ایک لمحے میں سمٹ آئی تھی۔ جو حاصلِ حیات تھا۔ بے گنتی خوابوں کی تعبیر تھا۔ زندگی کی پہلی اور آخری تمنا کا وہ خوب صورت و دلکش حاصل، وہ پیارا لمحہ۔ جیسے اب بھی جاگتی آنکھوں کا پُر فریب سپنا ہو۔ مشکل سے یقین آ رہا تھا۔

وسیع و خاموش ہال حسین و رنگین فانوسوں کی ٹھنڈی میٹھی اور مسحور کن روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ روشنی کے سیل بے پناہ نے دور و نزدیک کے مناظر کو اجال کے رکھ دیا تھا۔ نقشین اور پر کار چھت میں آویزاں باریک چمکیلے کاغذوں کے لہریے ہواؤں کی شوخیوں میں رہ رہ کے گنگنا اُٹھتے۔ یہ نغمگی دلوں میں عجیب سا گداز پیدا کر رہی تھی۔ آدمی اپنے آپ کو کسی ایسے سیارے کا باشندہ تصور کرنے لگتا تھا جہاں سے صرف مسرتیں اور خدائی نعمتیں تقسیم ہوتی ہیں۔

موسیقی! جسے سُن کر بہت کچھ یاد آتا ہے۔ مگر کیا یاد آتا ہے۔ آدمی اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔

ڈائس پر نس کالج کے طلباء و طالبات کی سلیقہ شعاری، نفاست پسندی اور حسن پرستی کا آئینہ دار تھا۔ وہاں نیم دائرے میں خوشنما نشستیں تھیں۔ لیکن یہ ابھی پُر نہیں ہوئی تھیں۔ ویسے خاموش حال میں شائقین شعر و ادب کی آمد سے پُر سکون فضا میں ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ کھنچے چلے آ رہے تھے۔ جیسے انسانی سمندر میں سیلاب آ گیا ہو۔

اربابِ درسگاہ کی آمد کے ساتھ ہی حاضرین میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ لاکھوں آنکھیں منتظر تھیں۔ دلوں میں طغیانِ شوق کروٹیں بدل رہا تھا۔

ایک مایۂ ناز، وحید العصر، اور بلند پایہ شاعر کو دیکھنے اور سننے کے لیے وہ سب گویا ایک پر ایک گر رہے تھے، سارا شہر ہی جیسے درس گاہ میں جمع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہ گئی۔

وہ سب شاعر و ادیب جو ادب و شعر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یہاں اکٹھا ہو گئے تھے۔

فلکِ شعر پر پوری آب و تاب سے ضیا بار آفتاب شعر عبدالعزیز خالد کی دید و شنید کے لیے۔

اور وہ سب سے بلند و برتر نشست پر جلوہ گر تھا۔ حسین و جمیل، شاعرِ بے مثیل و بے بدل، صورت میں سیرت میں بے مثال، اقلیمِ شعر کا تاجدار، الفاظ کا ساحر، معنویت کا راز داں، ماہرِ السنہ۔ وہ حقیقتاً کوئی سماوی ہستی لگ رہا تھا۔ اس کے پرستار کہتے تھے۔ سمندر کو صرف سمندر کہہ دینے سے اس کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے سینے میں کتنے صدف ہوتے ہیں۔ دربے بہا کے امانت دار، لوگ تو صرف لہریں گنتے ہیں۔ مدوجزر کا تماشا دیکھتے ہیں۔ گہرا کون اُترتا ہے۔

اور وہ فقید المثال شاعر اپنے حسنِ صورت کا جادو جگا رہا تھا۔ اپنے اشعار کے موتی بکھیر رہا تھا۔ رہ رہ کے ہال سے

تعریف و تحسین کا غلغلہ اُٹھتا۔ بار بار واہ واہ کے نعرے سنائی دیتے۔

ایک گوشے میں سب سے الگ تھلگ اس شہر کی ایک گمنام و بے نام قلم کار بھی موجود تھی۔ جس کے قلم کی بے معنی کاوشوں نے اسے ادبی حلقے میں متعارف تو کرادیا تھا۔ لیکن اس کی خانہ نشینی نے کسی کو اس کا صورت شناس نہ بنایا تھا۔

اس وقت وہ اپنے سارے اصول روند کر اپنے محبوب و پسندیدہ اور آئیڈیل شاعر کو دیکھنے آئی تھی۔ محبوب، آدرش، زندگی کا سہارا، اس کا بے حد پیارا۔ جو اس سے دور بہت دور تھا۔ لیکن اس نے ایک پاکیزہ رشتے کی ڈور میں باندھ کر اسے اپنے دل کے قریب بہت قریب کر لیا تھا۔ انسانوں کے اس ہجوم میں جہاں بے شمار آنکھیں خالد پر جمی تھیں۔ وہاں بھلا کون تھا جو دو پُرنم، سارے جسم کی طاقت، وید کی ساری توانائی اپنے اندر سمیٹے دو آنکھیں اسے حیرت و مسرت کے سنگم پر وم بخود اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھیں۔ اس حسین چہرے کو متواتر دیکھ رہی تھیں۔ جو آج ایک خواب کی مانند اس کے سامنے، بہشت بریں کے انجانے پھول، نیر تاباں، ماہ منور کی طرح تبسم ریز تھا۔ حسن جس چہرے کی بلائیں لے رہا تھا۔

بیس سال کی ایک بے شعور، ناپختہ معز سی لڑکی اپنے تنہا کمرے میں خالد کی غزلوں کا مجموعہ سامنے کھولے بیٹھی تھی۔ اور جیسے جیسے وہ اچھوتے، آبِ زمزم سے دُھلے شعر اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اُترتے رہتے تھے۔ ویسے ویسے یہ حقیقت اس پہ کھلتی جا رہی تھی کہ شاعری کا درجہ دینے والوں نے کسی مبالغے سے کام نہیں لیا۔ خالد کی شاعری الہام تھا۔ ساحری تھی، معجزہ تھی کیا تھی؟

وہ اپنے پیچھے اور ساتھ چلنے والوں کی تمام روایات اور سارے موضوعات کو کہیں بہت دُور چھوڑ کے بے انتہا آگے نکل گیا تھا۔ زمان و مکان کی حدوں سے بھی کہیں آگے۔ ہجر و وصال، شمع و پروانہ، گل و بلبل، اور لب و رخسار کی فرسودہ و پوشیدہ چار دیواری کا حصار توڑ کے وہ اپنی ایک الگ وسیع و عریض شاہراہ پر چل پڑا تھا۔

پیغمبروں تک کو استہزا اور ایذا کا نشانہ بنانے والوں نے اس پر طنز و تعریض، تضحیک و تمسخر کے پتھر پھینکے اور شاید اس کا دل لہولہان بھی ہوا۔ لیکن اس لہو سے اور بھی بہت سے لالے کھل گئے۔

وہ دشوار گزار منازل سے گزرتا، سنگلاخ راستوں کو اپنے قدموں سے موم بناتا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اور تب ہجومِ ناکساں میں اس شاعرِ بے مثال کو اپنا ایک سچا پرستار ملا۔

بے بضاعت سی قلمکار تھی وہ

موہوم و معدوم سی
جس کا دل پارہ صفت تھا
وہ خود سیماب آسا تھی
دکھوں سے پریشان
زخموں سے چُور چُور

جسے آرزو تھی کوئی ہم راز تو پاؤں کوئی ہمدم تو ملے

اسے ایک گھونٹ پانی کی تلاش تھی۔ اسے آبِ حیات کا پورا چشمہ مل گیا۔

اور تب اس دور کی چکور نے چودھویں کے چاند کے قریب پہنچنے کے لیے پر تولے۔

ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں، بے ربط تحریروں میں، جذبِ دل کی صحیح عکاسی نہ کرنے کے شدید ترین احساس تلے کچل کر۔۔۔